اسلامی معیشت کی خصوصیات

اور

نظامِ سرمایہ داری

نظامِ سرمایہ داری اور سوشلزم کے مقابلے میں اسلامی معیشت کی راہِ اعتدال
اور کارخانوں و مزدوروں کے تعلقات کے اسلامی اُصول

حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ
مفتی اعظم پاکستان

ادارۃ المعارف کراچی

اسلامی معیشت کی خصوصیّات

اور

نظامِ سرمایہ داری

نظامِ سرمایہ داری اور سوشلزم کے مقابلے میں

اسلامی معیشت کی راہِ اعتدال

اور

کارخانوں و مزدوروں کے تعلّقات کے اسلامی اُصول

حضرت مولانا مُفتی مُحمّد رفیع عُثمانی صاحب مدظلہ

مفتیٔ اعظم پاکستان

اِدارۃُ المعارِف کراچی ۱۴

باہتمام : محمد مشتاق شتی
طبع جدید : شعبان المعظم ۱۴۳۵ھ - جون ۲۰۱۴ء
مطبع : شمس پرنٹنگ پریس کراچی
ناشر : اِدارۃ المعارف کراچی۱۴

ملنے کے پتے:
اِدارۃ المعارف کراچی۱۴
فون: 021-35032020، 021-35123161
موبائل: 0300 - 2831960
ای میل: imaarif@live.com

مکتبہ معارف القرآن کراچی ۱۴ — دارالاشاعت، اُردو بازار، کراچی
ادارۂ اسلامیات، انار کلی، لاہور
بیت الکتب، گلشن اقبال، کراچی — مکتبۃ القرآن، بنوری ٹاؤن، کراچی

فہرستِ مضامین

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

عنوان	صفحہ نمبر

بابِ دوم
صنعتی تعلقات کے اسلامی اُصول ۱۱۹

عنوان	صفحہ نمبر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

یہ اب سے تقریباً سترہ سال پہلے کی بات ہے جب ۱۹۹۲ء میں مزدور یونینوں کی تنظیم ''نیشنل لیبر فیڈریشن'' نے جس کے سربراہ جناب شفیع ملک تھے اسلام آباد میں ''صنعتی تعلقات کے اسلامی ماڈل'' کے عنوان پر ایک سہ روزہ بین الاقوامی سیمینار منعقد کیا ــــ مجھے بھی اس موضوع پر مقالہ پیش کرنے کی دعوت دی۔ اُس وقت کمیونزم، سوشلزم اور ''سوویٹ یونین'' کو دُنیا کے نقشے سے غائب ہوئے مشکل سے ایک سال ہی گزرا تھا۔

مقالہ لکھنے سے تو میں نے ذاتی مجبوریوں کے باعث معذرت کرلی تھی، تاہم چند بنیادی اُصول زبانی پیش کیے، جن کو ''اسلامی معیشت کی خصوصیات اور صنعتی تعلقات'' کا عنوان دینا حقیقت کے زیادہ قریب ہوگا۔

میری یہ تقریر ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے قلم بند کرکے اس تنظیم نے اپنے ماہنامے ''الکاسب'' مؤرخہ مئی و جون ۱۹۹۲ء میں شائع کی، پھر مئی ۱۹۹۵ء میں یہ جماعتِ اسلامی کے ماہنامے ''ترجمان القرآن'' میں شائع ہوئی، اور متعلقہ علمی حلقوں میں اسے سراہا گیا۔

یہ تقریر بہرحال ایک تقریر ہی تھی، جب چھپ کر سامنے آئی تو اس میں مجھے جگہ جگہ تشنگی نظر آئی، اور ''اسلامی معیشت کی خصوصیات اور صنعتی تعلقات'' کے حوالے سے بہت سی تفصیلات اور اضافوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کام شروع کیا تو یہ اتنا دراز ہوتا چلا گیا کہ ضخامت اصل تقریر سے کئی گنا زیادہ ہوکر ایک بڑے مقالے کی صورت بن گئی۔

پھر اب سے ۶ سال پہلے جب یہ مقالہ کمپوز ہوکر سامنے آیا اور اس پر نظرِ ثانی شروع کی تو قدرتی طور پر ایسے حالات مسلسل پیش آتے چلے گئے کہ یہ کمپوز شدہ مسودہ نت نئے مشاغل کے انبار میں دَب کر رہ گیا، ـــــ اب عرصۂ دراز کے بعد پھر یہ سامنے آیا تو جتنی نظرِ ثانی ہوچکی تھی اُسی پر صبر کرکے ہدیۂ قارئین کیا جارہا ہے (البتہ بہت سے مزید اِضافے اِس وقت بھی کرنے کی نوبت آگئی)۔

اس اُمید پر کہ اللہ تعالیٰ اس حقیر کاوش کو مسلمانوں کے لئے نافع بنا کر شرفِ قبول سے نواز دے، اور ناچیز کے لئے زادِراہ بنادے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللهِ بِعَزِيزٍ۔

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ
خادمِ طلبہ جامعہ دارالعلوم کراچی
۱۸ر شوال ۱۴۳۰ھ
۸ر اکتوبر ۲۰۰۹ء

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

مقدّمہ

نَحْمَدُهٗ وَنُصَلِّيْ عَلٰى رَسُوْلِهِ الْكَرِيْمِ، وَعَلٰى آلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ، وَمَنْ تَبِعَهُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ۔

دُنیا پھر ایک دوراہے پر آپہنچی ہے، سوشلسٹ نظام (SOCIALISM) دَم توڑ چکا ہے، اور جس نظامِ سرمایہ داری (CAPITALISM) کی ضد پر سوشلزم وجود میں آیا تھا، وہی نظام اب پھر پوری دُنیا پر اکیلا دندنا رہا ہے۔ اقوامِ عالم کی نظریں پھر ایک ایسے نظامِ معیشت کی تلاش میں ہیں جو اِنسان کو سرمایہ دارانہ معیشت کے یک رُخے پن، اور معاشی ظلم و جور سے نجات دِلا کر عمومی خوشحالی اور حقیقی انصاف فراہم کر سکے۔ سوشلزم یہ دعویٰ لے کر وجود میں آیا تھا کہ وہ عوام کو نظامِ سرمایہ داری کے ظلم و فریب سے چھڑا کر اُن کے آلام و مصائب کو خوشحالی میں بدل ڈالے گا، لیکن سوشلزم خود احمقانہ ظلم و ستم کا بدترین نمونہ ثابت ہو کر اپنے منطقی انجام کو پہنچا، اور بالآخر جہادِ افغانستان کے نتیجے میں اُس کی اِینٹ سے اِینٹ بج گئی۔

سوشلزم کے بانیوں نے بقول ان کے نظامِ سرمایہ داری ہی کی چیرہ دستیوں کا علاج کرنا چاہا تھا، لیکن وہ اِن چیرہ دستیوں کی اصل جڑ کی صحیح تشخیص نہ کر سکے۔ نجی ملکیت کی بے لگام آزادی جو نظامِ سرمایہ داری کی ساری خرابیوں کی جڑ ہے، انہوں نے اس کے

بجائے خود ''نجی ملکیت'' (Private Property) ہی کو جرم قرار دے کر بالکل انتہاء پسندانہ راستہ اختیار کیا، اور لوگوں کے کارخانوں، دُکانوں، تجارتی مراکز اور زرعی زمینوں کی نجی ملکیت پر ایسا ہتھوڑا چلایا کہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ہلاک و برباد کر کے بھی معاشیات واقتصادیات کا کوئی مسئلہ حل نہ کر سکے، ۷۴ سال تک تقریباً نصف کرۂ ارض پر نت نئے مظالم کی مشقیں کرتے کرتے جب سوشلزم بے جان ہو کر گر پڑا اور درجنوں ممالک اس کے چنگل سے آزاد ہوئے، تو دُنیا نے دیکھا کہ اِن ممالک کی تجارت و معیشت تباہ ہو کر جاں بلب تھی ـــــ مریض کے جن دانتوں میں درد تھا، ان کے سوا سارے دانت اُکھاڑے جا چکے تھے ـــــ! چنانچہ ۱۹۹۱ء میں جب سوشلزم کی تجربہ گاہ ''سوویٹ یونین'' اپنا آخری سانس لے چکی، تو رُوس کے صدر ''بورس یلسن'' کو بڑی حسرت سے یہ کہنا پڑا کہ:

> ''کاش! سوشلزم کی خیالی جنت کا تجربہ رُوس جیسے عظیم ملک میں کرنے کے بجائے افریقہ کے کسی چھوٹے علاقے میں کر لیا گیا ہوتا، تا کہ اس کی تباہ کاریوں کو جاننے کے لئے ۷۴ سال نہ لگتے۔''
>
> (نیوز ویک)

غرض! نظامِ سرمایہ داری نے ایک انتہاء کو اپنایا کہ نجی ملکیت کو اتنا بے لگام کر دیا کہ سرمایہ داروں کو دِین و اَخلاق کی ہر بندش سے آزاد کر کے عوام اور مفلوک الحال غریبوں کا خون چوسنے کی کُھلی چھوٹ دے دی گئی، سوشلزم نے بالکل دُوسری انتہاء پر پہنچ کر سرے سے نجی ملکیت ہی پر ''ہتھوڑا اور درانتی'' چلا دی، جو نجی ملکیت کے ساتھ لاکھوں کروڑوں اِنسانوں کی زندگی ہی کا صفایا کرتی چلی گئی۔ اور سارے وسائلِ معاش حکومت (بیوروکریسی) کی ملکیت میں دے کر عوام کو فریاد کرنے کی آزادی سے بھی محروم کر دیا گیا۔

''سوویٹ یونین'' کے خاتمے کے بعد کرۂ ارض تیزی سے ایک شہر کی سی شکل اختیار کر رہا ہے، اور اس پورے گلوب پر جہاں جہاں سوشلزم کے ہٹنے سے خلاء پیدا ہوا ہے

نظامِ سرمایہ داری اس خلاء کو اپنے ''نیو ورلڈ آرڈر'' سے بھرنے کی فکر میں ہے، اور یہ باور کرانے کی کوشش کی جارہی ہے کہ سوشلزم کی ناکامی دراصل نظامِ سرمایہ داری کی ''حقانیت'' کی دلیل ہے۔

اسلامی معیشت کی خصوصیات

اس موقع پر جبکہ انسانیت اِن دونوں معاشی نظاموں کی انتہاپسندی کے تلخ و سنگین نتائج بھگت کر بیچ کی راہ تلاش کر رہی ہے، مسلم ماہرینِ معاشیات، مسلم زُعماء اور مسلم سرمایہ کاروں کی اس ذمہ داری میں اور اِضافہ ہوگیا ہے کہ وہ اسلام کی معاشی تعلیمات کا بالغ نظری سے مطالعہ فرمائیں ـــــ اسلام جو دِینِ فطرت ہے اور سرمایہ داری و سوشلزم کے بیچوں بیچ راہِ اِعتدال ہے اُس سے دُنیا کو واقف کرائیں، بلکہ اُسے مسلم ممالک میں روبہ عمل لاکر اِسلام کے اس دعوے کا منہ بولتا ثبوت فراہم کریں کہ موجودہ معاشی بگاڑ کا حل، اور اِنسانوں کی عمومی خوشحالی، اگر پھر سے دُنیا کے مقدر میں ہے تو وہ صرف اسلام ہی کی فطری اور معتدل تعلیمات سے نصیب ہوسکتی ہے۔

صنعتی تعلقات

معاشیات کے میدان میں ایک اہم دائرہ ''صنعتی تعلقات'' کا ہے، جو ''آجر'' یعنی مُستأجر (Entrepreneur) اور ''اَجیر'' یعنی مزدور و ملازم (Labour) کے درمیان قائم ہوتے ہیں اور معاشرے پر بہت دُور رَس، گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ اِن کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ بیسویں صدی کے آغاز میں یورپ کے نظامِ سرمایہ داری میں یہی تعلقات تھے جن کی شدید ناہمواری نے سوشلزم کو جنم دے کر پوری دُنیا کو زیر و زبر کرڈالا تھا۔

آج بھی یہ تعلقات، صنعتی و تجارتی دُنیا کا ایک حسّاس اور حل طلب مسئلہ ہیں،

آجر واَجیر کے درمیان ختم نہ ہونے والی کشمکش جاری ہے، ہر فریق دُوسرے کا شاکی، بلکہ اس سے خوف زدہ ہے، کبھی ہڑتالوں کی نوبت آتی ہے، کبھی تالہ بندی کی، بسااوقات یہی کشمکش کارخانوں کو مستقل طور پر بند، اور مزدوروں کو بے روزگار کرڈالتی ہے، یہی سلسلہ دراز ہوجائے تو خمیازہ قوموں کو بھگتنا پڑتا ہے ــــــ لہٰذا معاشی سرگرمیوں کو اس کشمکش سے بچائے رکھنا، اور صنعتی تعلقات کو متوازن، منصفانہ، خوشگوار اور نتیجہ خیز بنانا ہر معاشی نظام کی بنیادی ضرورت ہے۔

یہاں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اسلام نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کیا اُصول اور ہدایات دی ہیں؟ معاشی میدان پر ان کے کیا اثرات ہوتے ہیں؟ اور نظامِ سرمایہ داری اس بنیادی ضرورت کو کیوں پورا نہ کرسکا؟

اس کے لئے ہمیں اپنی گفتگو کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑے گا، پہلے حصے میں اُن خصوصیات کو سامنے لانا ہوگا جو اِسلام کی معاشی تعلیمات کو دُوسرے نظاموں خصوصاً نظامِ سرمایہ داری سے ممتاز کرتی، اور صنعتی تعلقات پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں۔ نیز موجودہ نظامِ سرمایہ داری میں پائی جانے والی بعض اُن بیماریوں کی نشاندہی بھی کرنی ہوگی جنھوں نے دولت کے بہاؤ میں سنگین عدمِ توازُن، بلکہ یک رُخاپن، پیدا کرکے اِنسانوں کو غریب واَمیر کے دو متحارب طبقات میں تقسیم کرڈالا ہے، اور نہ صرف غریب اور مزدور طبقے کی معاشی آزادی چھین کر اُسے آلام ومصائب اور مایوسیوں کے حوالے کردیا، بلکہ خود مال دار طبقے کو بھی حقیقی عزّت اور راحت ومسرّت سے ناآشنا بنادیا ہے۔ چونکہ سوشلزم کا نظام تو اب دم توڑ چکا ہے اس لئے اب ہماری گفتگو کا رخ زیادہ تر نظامِ سرمایہ داری کی طرف رہے گا۔

دُوسرے حصے میں اِن شاء اللہ "صنعتی تعلقات" کے اسلامی اُصول وہدایات کا بیان ہوگا، اور حسبِ ضرورت ان کا موازنہ موجودہ نظام سے کیا جائے گا۔

بابِ اوّل

اسلامی معیشت کی خصوصیات

①

خدائی نظام

اسلام معاشیات کی سب سے پہلی، اور بنیادی خصوصیت جو اسے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد بناتی ہے، یہ ہے کہ اس کے بنیادی اُصول اور حدود کسی انسان کے مقرّر کئے ہوئے نہیں ہیں، کیونکہ اسلام کسی انسان کو دُوسرے انسانوں پر اپنی آزاد عقل مسلط کرنے کا اِختیار نہیں دیتا، وہ انسانوں کے کسی گروہ کو بھی خواہ وہ پارلیمنٹ ہی کیوں نہ ہو، یہ اِختیار نہیں دیتا کہ وہ من مانے طور پر دُوسروں پر حکمرانی کریں، یا بندگانِ خدا پر خودساختہ قوانین اپنی آزاد مرضی سے نافذ کریں۔ چنانچہ زندگی کے دُوسرے شعبوں کی طرح معاشیات کے میدان میں بھی انسانی معاشرے کو ظلم وفریب اور باہمی عداوت وفساد سے بچانے کے لئے جائز وناجائز اور حلال وحرام کی کچھ بنیادی حدود، اللہ ربّ العالمین نے خود مقرّر فرمادی ہیں، جو ساری کائنات کا اور تمام اُمیر وغریب انسانوں کا خالق ومالک ہے، اُن پر اُن کے ماں باپ سے بھی کہیں زیادہ مہربان ہے، اور ان کے نفع ونقصان کو اُن سے زیادہ جانتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ تصوّر نہیں کیا جاسکتا کہ اُس نے یہ اُصول کسی خاص طبقے کے مفاد میں جانبداری سے مقرّر کئے ہوں گے، اور دُوسروں کے مفادات کو پسِ پشت ڈال دیا ہوگا۔ یا نعوذ باللہ نادانستہ طور پر غلط رہنمائی کی ہوگی۔

برخلاف نظامِ سرمایہ داری اور سوشلزم کے کہ اِن دونوں کی ماں "فلسفۂ مادّیت" (Materialism) ہے، عمارتیں انہوں نے اگرچہ اپنی الگ الگ تعمیر کی ہیں جو ایک دُوسرے سے بہت مختلف اور متضاد ہیں، لیکن اصل نظریاتی بنیاد دونوں کی "فلسفۂ مادّیت" ہے جس میں خدا کا کوئی وجود نہیں۔ اِن نظاموں کے قائم کردہ اُصول انسانوں ہی کے

بنائے ہوئے ہیں، جن کو نہ خطاء ولغزش سے پاک تصوّر کیا جاسکتا ہے، نہ طبقاتی یا ذاتی مفادات سے بالاتر سمجھا جاسکتا ہے۔

اسلام سے اِن دونوں نظاموں کا سب سے پہلا اور بنیادی اِختلاف یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ سب سے پہلے اسی بنیادی اِختلاف کو سمجھا جائے۔ اسلام کے بنیادی عقیدے اور ''فلسفۂ مادّیت'' کا حاصل اگر سامنے رہے گا تو اِن شاء اللہ آگے کی تفصیلات کا دِل میں اُترنا آسان ہوگا۔

مادّی فلسفہ (Materialism) کیا ہے؟

فلسفۂ مادّیت کا حاصل اور لُبِّ لُباب یہ ہے کہ ''مادّہ'' (Matter) جو نہایت باریک ذرّات (Atoms) کی صورت میں فضا میں پھیلا ہوا ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا، اس کے علاوہ کوئی ہستی اپنا مستقل وجود نہیں رکھتی، رُوح (Soul) کا بھی کہیں وجود نہیں[۱] اور خدا کا وجود ماننا بھی ''توہّم پرستی'' کے سوا کچھ نہیں۔ مادّے کو کسی نے پیدا نہیں کیا، بلکہ کائنات کی ہر چیز اُسی سے بنی ہے۔ یہ مادّہ بذاتِ خود زندگی سے محروم ہے، چنانچہ وہ کسی چیز کا علم یا کسی قسم کا اِختیار اور عقل وشعور بھی نہیں رکھتا، نہ دیکھ سکتا ہے، نہ سُن سکتا ہے، نہ سوچ سکتا ہے، نہ بول سکتا ہے، نہ کسی کام کا اِرادہ کرسکتا ہے، نہ کسی اچھائی یا بُرائی کو پہچان سکتا ہے۔ کیونکہ وہ تو زندگی سے محروم ہے۔

لیکن اس کی ایک خاصیت، جو اس سے کبھی جدا نہیں ہوتی حرکت یا قوت ہے۔[۲] اسی حرکت کے نتیجے میں مادّے کے ذرّات (Atoms) سے خود بخود مختلف قسم کے عناصر بنے، مثلاً آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن وغیرہ، پھر یہی عناصر (Elements)، جن کی اب

---

۱ بعض مادّیین (Materialists) نے رُوح کا وجود تو تسلیم کیا، لیکن اُسے بھی مادّے کی پیداوار قرار دیا ہے۔

۲ بعض مادّیین نے یہاں حرکت کے بجائے ''قوت'' کی اِصطلاح اِستعمال کی ہے۔ ملاحظہ ہو ''مبادئ فلسفہ'' از عبدالماجد دریابادی، حصہ اوّل ص:۱۰۱۔

تک تقریباً ۱۰۴ قسمیں دریافت ہوئی ہیں۔ جب مختلف مقداروں، مختلف ترتیبوں اور مختلف حالات میں باہم ملتے ہیں، تو اِن سے طرح طرح کی چیزیں خود بخود وجود میں آتی رہتی ہیں۔

چنانچہ یہ عناصر کبھی باہم مل کر پانی بن جاتے ہیں کبھی ہوا، کبھی آگ بن جاتے ہیں کبھی مٹی۔ انہی کے مجموعے سے کہیں سورج بن گیا ہے کہیں سیارے، کہیں چاند بن گیا ہے کہیں زمین۔ یہی بے جان مادّہ اپنی حرکت وقوّت کی بدولت کبھی نباتات کی شکل اختیار کرلیتا ہے کبھی معدنیات کی۔ کائنات کی ساری قدرتی مخلوقات اِن ذرّات ہی کی غیر اِرادی حرکت سے اِتفاقاً وجود میں آتی گئی ہیں، کسی نے انہیں جان بوجھ کر پیدا نہیں کیا۔ یہ مادّی ذرّات ہی مختلف مقداروں میں جب ایک متعین ترتیب کے ساتھ، مخصوص انداز میں، باہم ملتے ہیں تو اس کیفیت کو ''حیات'' (زندگی) کہتے ہیں، اور جب یہ ترکیب وترتیب باقی نہیں رہتی تو اس کو ''موت'' کہا جاتا ہے۔[۱]

چنانچہ زندگی (Life) بھی اسی طرح محض مادّے سے اِتفاقاً وجود میں آئی، دُنیا کا پہلا مرد اور پہلی عورت بھی مادّے کی اسی مسلسل غیر اِختیاری حرکت کے نتیجے میں، رفتہ رفتہ، خود بخود، بغیر کسی مقصد کے محض اِتفاق کے سہارے وجود میں آ گئے تھے، پھر اِن کے ملاپ سے اُن کی نسل چل پڑی، دُنیا کے سارے قسم قسم کے جانور بھی اسی طرح وجود میں آتے گئے۔ انسان کے اِحساسات، رنج ومسرّت اور راحت وتکلیف بھی اس کے جسمانی ذرّات ہی کی مختلف حرکات کی مختلف شکلیں ہیں، مادّے سے باہر کوئی چیز نہیں۔

لہٰذا سارا نظامِ عالم جب مادّے اور اُس کی حرکت وقوّت سے ''خود بخود'' محض اِتفاقات کے سہارے چل رہا ہے تو ہمیں نہ رُوح کا وجود ماننے کی ضرورت ہے نہ ایسے خدا کا، جو زِندہ ہو، دیکھتا سُنتا ہو، اور ہر چیز سے باخبر ہو، جو اپنے اِرادے سے جو چاہے کرسکتا

---

[۱] تفصیل کے لئے دیکھئے ''مبادیٔ فلسفہ'' حصۂ اوّل از عبدالماجد دریابادی، ص: ۲۳ تا ص: ۲۶ وص: ۱۰۱ تا ۱۰۲۔

ہو، جو جائز وناجائز، اچھے بُرے، اور حلال وحرام کی حدود مقرّر کر کے ہماری لامحدود آزادیوں پر دِین ومذہب کے پہرے بٹھاتا ہو، اور نافرمانی پر سزا دینے کی قدرت رکھتا ہو۔

اس فلسفے کی رُو سے انسان بھی کسی کے سوچے سمجھے منصوبے اور کسی مقصد کے بغیر محض اِتفاقاً وجود میں آ گیا ہے، یہ بھی ایک قسم کا ترقی یافتہ جانور ہے، اس میں عقل بھی ہے جو مادّے کے اِنہی ذرّات کی حرکت وقوّت سے اِتفاقاً خود بخود پیدا ہوگئی ہے، تاہم انسان کا کام بھی سوائے کھانے پینے اور آزادانہ زندگی گزارنے کے کچھ نہیں۔ مر کر یہ بھی ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے گا، اس کے بعد نہ دوبارہ زندگی ہے نہ یومِ آخرت، نہ جنت نہ دوزخ، لہٰذا مرنے کے بعد کسی اچھے بُرے عمل کی جزاء وسزا کا بھی اس فلسفے میں کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ حلال وحرام کا تصوّر بھی بے معنیٰ اور توہُّم پرستی ہے۔ لہٰذا اِنسان کو حق ہے کہ وہ زندگی کے دُوسرے شعبوں سمیت اپنا سیاسی ومعاشی نظام بھی اپنی آزاد مرضی سے تشکیل دے، کسی دِین ومذہب کو اس میں مداخلت کا حق نہیں پہنچتا ____!

یہی وہ فلسفہ ہے جس کے بطن سے بے لگام مغربی جمہوریت اور سرمایہ داری کا مکارانہ نظام نمودار ہوا، اور سوشلزم کے احمقانہ اور جابرانہ فساد نے آدھی دُنیا کو ستر سال تک طرح طرح کے آلام ومصائب میں جکڑے رکھا، اور جس کے نتیجے میں آج بھی دُنیا کی غریب اور کمزور قومیں سرمایہ دار عالمی طاقتوں کی شکارگاہ بنی ہوئی ہیں ۔

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو، پھر کیا
طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

جلالِ پادشاہی ہو یا جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دِیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اسلام کا عقیدہ

مادّی فلسفے کے برخلاف اسلام کا بنیادی عقیدہ یہ ہے کہ ہر چیز کا خالق ''اللہ'' ہے، مادّے (Matter) اور حیات (Life) کو بھی اُسی نے پیدا کیا ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور

ہمیشہ رہے گا، اُس کے سوا کوئی ہستی اپنا مستقل وجود نہیں رکھتی، وہ ایک ہے، زندہ ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں، اور اُس جیسا کوئی نہیں، اُسے کسی نے پیدا نہیں کیا، اُسی نے سب کو پیدا کیا ہے، اُس کا کوئی ماں باپ نہیں، اُس کا کوئی بیٹا، بیٹی یا بیوی نہیں۔

مادّے کی حرکت وقوت اور مادّے کی ساری خاصیات کا خالق بھی ''اللہ'' ہے، اُس کے بے کراں علم سے زمانے کا کوئی لمحہ اور کائنات کا کوئی ذرّہ پوشیدہ نہیں، اُس کی بے انتہا قدرت سے کوئی وجود باہر نہیں، وہ سب کچھ دیکھتا ہے، سُنتا ہے، اور کلام فرماتا ہے، لیکن اُس کا کلام ہمارے کلام کی طرح نہیں۔ کمال اور خوبی کی ساری صفات اُس میں ہیں، وہ ہر عیب اور نقص سے پاک ہے، اُس کی ساری صفتیں ہمیشہ سے ہیں، ہمیشہ رہیں گی، اُس کو نشانیوں اور صفتوں سے سب جانتے ہیں، مگر اُس کی ذات کی حقیقت و ماہیت کو کوئی نہیں جان سکتا۔

کائنات کا کوئی ذرّہ اُس کے اَزَلی علم، اِرادے اور حکم کے بغیر ہل نہیں سکتا، کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے اُسی کے علمِ اَزَلی کے مطابق اور اُسی کے اِرادے اور حکم سے ہوتا ہے، اُس کا کوئی حکم اور قول وفعل حکمت ومصلحت سے خالی نہیں، یہ اور بات ہے کہ ہم ہر حکمت ومصلحت کو نہ جان سکیں۔

اُسے کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، وہ اپنے فائدے اور نقصان سے بالاتر اور بے نیاز ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں، سب اُس کے محتاج ہیں، بندوں کی صحت و بیماری، حیات وموت، رزق وتنگدستی اور عزّت وذِلّت سب اُسی کے حکم کے تابع ہے، وہی عبادت کا مستحق ہے، اُس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں، وہ اپنی مخلوق پر ماں باپ سے بھی بدرجہا زیادہ مہربان ہے۔

یہ کارخانۂ عالم محض اِتفاقاً، بغیر کسی مقصد وحکمت کے، خود بخود وجود میں نہیں آ گیا، بلکہ ''اللہ'' ہی ہے جو اس کارخانۂ عالم کو اپنے اَزَلی علم اور اپنے طے کردہ نقشے اور ترتیب کے مطابق، اپنے اِرادے اور قدرت سے، عدم سے وجود میں لایا ہے، اُسی نے اس

مادّی عالم کا نہایت محکم و مربوط نظام مقرّر کیا، اور وہی اس کی نگہبانی کر رہا ہے۔

سارے قوانینِ قدرت، جو اس عالم اور ساری مخلوقات میں جاری ہیں، وہ بھی اُسی نے اپنے بے مثال قدرت وحکمت سے پیدا اور مقرّر کئے ہیں تا کہ مخلوق پر اُس کی قدرت وحکمت کا، اُس کی رحمت وعظمت کا، اور اس کے بے نقص کمال ویکتائی کا ظہور ہو۔

لیکن وہ خود اِن قوانینِ قدرت کا پابند نہیں، وہ جب چاہے آگ کو جلانے سے، پانی کو بہنے سے، اور چھری کو کاٹنے سے روک دے، بلکہ وہ کبھی کبھی ایسا کرتا بھی ہے، تا کہ بندوں پر واضح کر دے کہ وہ اِن قوانین کا پابند نہیں بلکہ خالق اور موجد ہے۔ اور اسے یہ بھی قدرت ہے کہ جب چاہے اِن سارے قوانینِ قدرت کو بدل ڈالے، وہ جو چاہے کرتا ہے۔

ہر جاندار میں زندگی اور شعور بھی اُسی نے پیدا کیا ہے، اُس نے کچھ مخلوقات کو (نور سے) پیدا کیا، اور ان کو ہماری نظروں سے چھپا رکھا ہے، ان کو ''فرشتہ'' (ملائکہ) کہتے ہیں، بہت سے مختلف کام ان کے حوالے ہیں، وہ کبھی اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ نے کچھ مخلوق آگ سے بنائی ہے، وہ بھی ہم کو عموماً دکھائی نہیں دیتی، ان کو ''جن'' یا ''جنات'' کہتے ہیں، اُن میں نیک وبد سب طرح کے ہوتے ہیں۔[1]

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ''اشرف المخلوقات'' بنا کر دُنیا میں اپنا خلیفہ (نائب) مقرّر کیا ہے، دُنیا میں پائی جانے والی ہر چیز، ہر توانائی (انرجی) اور تمام قدرتی وسائل کو اُس نے انسان کے لئے پیدا کیا ہے، تا کہ وہ اپنی عقل، غور وفکر اور تحقیق وجستجو سے اِن کو دریافت کرے اور اللہ کی مقرّر کردہ حدود میں اپنے نفع کے لئے استعمال کر سکے۔

اُس نے اپنے بندوں کو ایسے کسی کام کا حکم نہیں دیا جو اُن کی قدرت سے باہر ہو۔

وہ توبہ اور دُعا کو قبول کرنے والا اور گناہوں کو بخشنے والا ہے۔ وہ انصاف والا ہے، جو لوگ سزا کے قابل ہیں ان کو سزا دیتا ہے۔

---

[1] قرآن وسنت میں ان کے متعلق جو تفصیلات آئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مخلوق (جنات) عقل وفہم کے اعتبار سے انسان کے بہت قریب مگر ان سے کم درجے میں ہے۔

اللہ ہی نے اپنے رسولوں اور انبیائے کرام کے ذریعے- جو خود بھی انسان تھے اور گناہوں سے پاک تھے- انسان کو دُنیا میں زندگی گزارنے کے لئے ایک ''ضابطۂ حیات'' دیا ہے جسے ''دِینِ اسلام'' کہا جاتا ہے۔ سب سے پہلے نبی (پیغمبر) حضرت آدم (علیہ السلام) تھے، اور سب سے آخری نبی ''محمدؐ'' (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں، باقی انبیائے کرام درمیان میں آئے، جن میں حضرت نوح، حضرت اِبراہیم، حضرت داؤد، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ (علیہم السلام) زیادہ مشہور ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بہت سی چھوٹی بڑی کتابیں، ایک عظیم فرشتے ''جبرئیل'' (علیہ السلام) کے ذریعے بہت سے پیغمبروں پر اُتاریں، تاکہ وہ اپنی اپنی اُمتوں کو اللہ تعالیٰ کے اَحکام اور دِین کی باتیں بتائیں۔ اِن میں چار کتابیں بہت مشہور ہیں (۱) توراۃ، جو موسیٰ (علیہ السلام) پر نازل ہوئی (۲) زَبور، جو داؤد (علیہ السلام) پر نازل ہوئی (۳) اِنجیل، جو عیسیٰ (علیہ السلام) پر نازل ہوئی (۴) القراٰن الکریم، یہ سب سے آخری کتاب ہے اور سب سے آخری نبی ''محمدؐ'' رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل فرمائی گئی ہے۔ اِن کے بعد قیامت تک نہ کوئی اور کتاب اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے گی، نہ کوئی نیا نبی۔

پچھلی کتابوں کو گمراہ لوگوں نے بہت کچھ بدل ڈالا، مگر ''قرآنِ کریم'' کی حفاظت کا، اللہ تعالیٰ نے خود قرآنِ کریم میں وعدہ فرمایا ہے، اس میں ذَرّہ برابر رَدّوبدل آج تک نہ کیا جاسکا ہے نہ آئندہ کیا جاسکے گا۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے دِین ''اسلام'' کی تکمیل، اپنے بالکل آخری نبی ''محمدؐ'' (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل کی جانے والی کتاب "القُراٰن" کے ذریعے، اور نبیِ اکرم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ تشریحات اور تعلیمات "السُنَّة" کے ذریعے کرکے، بنی نوعِ انسان پر قیامت تک کے لئے اپنی حجت تمام کردی ہے۔

"القراٰن" اور "السُنَّة" میں قیامت تک پیش آنے والے دُنیا بھر کے حالات وواقعات کے اَحکام ومسائل- جن کو "الشَّرِیْعَه" کہا جاتا ہے- اس طرح بیان کردیئے

گئے ہیں کہ بہت سے مسائل کی تو جزئی تفصیلات بھی بتادی گئی ہیں، اور باقی تمام مسائل کے لئے قرآن وسنت میں ایسے اُصول اور قواعد رکھ دیئے گئے کہ جن کی روشنی میں اُمت کے ماہر علمائے دِین یعنی ''فقہائے کرام'' اپنے اپنے زمانے اور اپنے اپنے علاقے میں پیش آنے والے نت نئے مسائل کا حکم دریافت کرسکیں، اور اُمت کی رہنمائی کرسکیں۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے حلال بھی بتادیا حرام بھی، فرائض بھی بتادیئے، حقوق بھی، اپنی پسند بھی بتادی ناپسند بھی، اِن باتوں کو سمجھنے کے لئے عقل بھی دی، اور اچھے بُرے میں سے کسی ایک کو اِختیار کرنے کی قدرت بھی دے دی، تاکہ وہ اپنے بندوں کا اِمتحان لے، یعنی بندوں پر جتادے کہ کون فرماں بردار ہے کون نافرمان۔ اس اِمتحان کا تھوڑا بہت نتیجہ وہ جزاء سزا کی صورت میں دُنیا میں بھی دِکھلا دیتا ہے، لیکن پورا نتیجہ ''آخرت'' میں دِکھائے گا۔

انسان، جو جسم اور رُوح کا مجموعہ ہے، مرنے کے بعد فنا (بالکل معدوم) نہیں ہوجاتا، بلکہ اس کی رُوح ایک ایسے عارضی عالم میں، جو ہماری نظروں سے پوشیدہ ہے، اور جسے ''بَرزَخ'' کہتے ہیں، منتقل ہوجاتی ہے، جہاں جسم اور رُوح کا رشتہ بعینہٖ اُس طرح تو برقرار نہیں رہتا جس طرح دُنیا میں تھا، لیکن جسم اگرچہ گل سڑکر ریزہ ریزہ ہوگیا ہو، رُوح باقی رہتی ہے، اس کا سابق جسم یا اُس کے بعض اجزاء سے ایک گونہ تعلق بھی باقی رہتا ہے، اس تعلق کی پوری حقیقت اور تفصیل ہمیں نہیں بتائی گئی، تاہم دُنیا کے اچھے بُرے اعمال کی کچھ جزا وسزا کا سلسلہ ایک حد تک وہاں بھی جاری رہتا ہے۔

پھر جب اللہ کے حکم سے قیامت آئے گی تو تمام جاندار مرجائیں گے، اور یہ کارخانۂ عالم بالکل درہم برہم ہوجائے گا، اس کے بعد تمام انسانوں اور جنات کو ایک اور عالم (آخرت) میں دوبارہ زِندہ کیا جائے گا، جہاں ''میدانِ حساب'' میں سارے انسان جمع ہوں گے اور ان کے دُنیا میں کئے ہوئے تمام اچھے بُرے اعمال و اَقوال کا حساب ہوگا، جن کا مکمل ریکارڈ اللہ تعالیٰ کے پاس محفوظ رہتا ہے۔ فرماں برداروں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے

دائمی جوانی وصحت، اور راحتوں، لذتوں، مسرتوں اور مرادوں سے بھری ''جنت'' کی زندگی ملے گی، جہاں کبھی موت نہیں آئے گی اور کسی قسم کے غم، بیماری یا خوف کا گزر نہ ہوگا، تاکہ فرماں برداروں پر ہمیشہ ہمیشہ اللہ کی رحمتوں اور عجیب وغریب نعمتوں کا ظہور ہوتا رہے۔ اور نافرمانوں (کافروں) کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ''جہنم'' کی آگ میں جھونک دیا جائے گا، جہاں ان کو بھی کبھی موت نہیں آئے گی، تاکہ نافرمانوں پر اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب کا ظہور ہوتا رہے۔

جن لوگوں کا مرنے سے پہلے دُنیا میں عقیدہ تو اِسلام کے مطابق تھا (ایمان رکھتے تھے) مگر عمل اسلام کے مطابق نہیں تھا (عملی طور پر گنہگار تھے) اور انہوں نے دُنیا میں ''توبہ'' یا تلافی بھی نہیں کی تھی، ان میں سے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا سزا دیئے بغیر ہی جنت میں داخل فرمادے گا، اور جس کو چاہے گا سزا دینے کے بعد جنت میں داخل فرمائے گا۔ ہر ایک کو اس کا حق، جو کسی نے مارا ہوگا، وہاں دِلوادیا جائے گا۔

یہ ہے اسلام کا عقیدہ جس میں غور کیا جائے تو اُن تمام ذہنی اُلجھنوں اور سوالات کا اِطمینان بخش حل موجود ہے جن سے فلسفۂ مادّیت کترا کر نکل جانا چاہتا ہے اور جن کے جواب سے وہ بالکل عاجز چلا آرہا ہے۔

اس عقیدے کا مرکزی نقطہ یہ ہے کہ ساری کائنات اور اس میں پائی جانے والی ہر چیز کا خالق اللہ ہے، مادّے اور اس کی حرکت وقوّت کو، اور حیات اور عقل وشعور کو بھی اُسی نے اپنی لامحدود قدرت وحکمت سے پیدا کیا ہے، اس کائنات میں جو کچھ بھی ہورہا ہے، وہ محض حالات کے جبر یا اِتفاقات کے سہارے نہیں ہورہا، بلکہ اُسی حکیمِ مطلق کے طے کردہ نقشے اور ترتیب کے مطابق اور اسی کے حکم واِرادے سے ہورہا ہے۔

اسلامی عقیدے میں بعض باتیں ایسی تو ہوسکتی ہیں کہ جن کی سائنسی توجیہ تک ہمارے ذہن کی رسائی نہ ہو، لیکن یہ اُس کے غلط ہونے کی دلیل نہیں بن سکتی، کیونکہ اس کارخانۂ عالم میں کتنے بے شمار حقائق آج بھی ایسے موجود ہیں جن کی سائنسی توجیہ تاحال

نہیں کی جاسکی، اس کے باوجود اُن کا وجود بدیہی طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ پھر اِسلامی عقیدے کی ایسی باتیں جن کی سائنسی توجیہ تک حتمی طور پر ہمارا ذہن نہ پہنچ سکے اور ہمارے ذہن کی رسائی نہ ہوسکے، اُن کو بھی اہلِ اسلام نے محض سنی سنائی افواہوں یا من گھڑت توہمات کی بنیاد پر تسلیم نہیں کرلیا، بلکہ اللہ تعالیٰ کے رسولِ برحق حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی اس قطعی، واضح اور صریح خبر پر تسلیم کیا ہے کہ یہ باتیں اُن کو اللہ تعالیٰ نے ''وحی'' کے ذریعے بتلائی ہیں، جبکہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل ودیانت، راست بازی اور بے لاگ سچائی کی گواہی خود ان کے جانی دُشمنوں نے بھی دی ہے، ان کی پاکیزہ زندگی ایک کھلی کتاب ہے، جس سے ہر عاقل بالغ انسان اُن کی صداقت وحقانیت کا اِطمینان حاصل کرسکتا ہے، کسی انسان کے حالاتِ زندگی اور اَقوال اتنی تفصیل اور اتنی اِحتیاط کے ساتھ محفوظ نہیں کیے گئے جتنے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے، پیدائش سے وفات تک، محفوظ ہیں، کسی انسان کے حالاتِ زندگی پر اتنی تصنیفیں، اتنی زبانوں میں نہیں لکھی گئیں جتنی اُن کے بارے میں لکھی گئی ہیں۔ پھر ان کی صداقت وحقانیت پر روایتی، معجزاتی اور مشاہداتی، ناقابلِ انکار قطعی دلائل موجود ہیں جن تک ہر طالبِ حق کی رسائی تھوڑی سی کوشش سے ہوسکتی ہے۔

تاہم اسلامی عقیدے میں ایسی کوئی بات پوری تلاش وجستجو کے بعد بھی آپ کو نہیں ملے گی جسے عقل ماننے سے انکار کرتی ہو، یعنی جس کی نفی پر عقل یا سائنس کے پاس کوئی قطعی دلیل موجود ہو۔ بلکہ اہلِ اسلام کا دعویٰ تو یہ ہے کہ جو بات سائنس کی ایک مُسَلَّمہ حقیقت (Fact) کے طور پر، قطعی درجے میں ثابت ہوجائے وہ اِسلام کے کسی عقیدے کے خلاف نہیں ہوسکتی، اور جو خلاف ہو وہ کوئی سائنسی مفروضہ یا نظریہ (Theory) تو ہوسکتا ہے قطعی طور پر ثابت شدہ سائنسی حقیقت (Fact) نہیں ہوسکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم اور پیغمبرِ اِسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اِنسان کو جابجا عقل کے اِستعمال اور غور وفکر کی تاکید فرماتے ہیں، تاکہ اس کے نتیجے میں اللہ پر اُس کا ایمان اور راسخ ہوتا چلا جائے۔

اسلام ہمیں ترکِ دُنیا کی تعلیم بھی نہیں دیتا، اس کے برعکس وہ ترکِ دُنیا (رَہبانیت) کو سختی سے منع کرتا ہے، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر قرآنِ حکیم نے تو یہ چشم کشا اور ولولہ انگیز اِعلان کر رکھا ہے کہ:

هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا

(اللہ) وہی ہے جس نے پیدا کیا تمہارے فائدے کے لئے جو کچھ بھی زمین میں ہے سب کا سب۔ (سورۃ البقرۃ:۲۹)

اللہ رَبّ العالمین نے یہ ارشاد فرما کر نہ صرف رَہبانیت اور ترکِ دُنیا کی جڑ کاٹ دی ہے بلکہ انسان کو تحقیق و جستجو اور سائنسی و دُنیاوی ترقی کی بھی انتہائی کشادہ شاہراہ پر لا کھڑا کیا ہے، تا کہ وہ اپنی عقل اور مشاہدات و تجربات سے پورے کرۂ ارض پر اور اس کے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی اللہ تعالیٰ کی بے شمار عجیب و غریب نعمتوں کو دریافت کر کے اُس کی مقرّر کردہ حدود میں اپنے نفع کے لئے استعمال کر سکے۔

اسلام کا یہ عقیدہ اُن مضحکہ خیز اور خلافِ عقل عقیدوں سے بھی بالکل مختلف اور متضاد ہے جو کلیسا نے یورپ پر قرونِ وُسطیٰ (Mediaeval Era) اور وہاں کے تاریک دور (Dark Ages) سے مسلط کئے ہوئے تھے، اور جو مُسلّمہ سائنسی حقائق کے سامنے کھڑے نہیں رہ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ یورپ کے صنعتی اِنقلاب نے وہاں کی ذہین اور مُہم جُو اَقوام کو سائنس اور صنعت و حرفت کے میدانوں میں ترقی کی جس شاہراہ پر ڈال دیا تھا، کلیسا کا خود ساختہ مذہب اُس میں سب سے بڑی رُکاوٹ ثابت ہوا، اور خلافِ فطرت ہونے کے باعث بالآخر شکست سے دوچار ہوا، رَہبانیت اور ترکِ دُنیا اُس کا بنیادی اُصول تھا، وہ سرے سے صنعت و تجارت ہی کو ناپسند کرتا تھا، علم و حکمت پر سنگین پہرے تھے، حکماء اور سائنس دان اس کے نزدیک ایسے ناقابلِ رحم مجرم تھے جن کو سخت سے سخت سزا دینا ایک مقدس فریضہ تھا، دُنیا کی ہر ترقی سے بیزاری کو، اور عوام کی راحت و مسرّت سے نفرت کو ''تقویٰ'' کا اعلیٰ معیار قرار دے دیا گیا تھا۔

(۲)

مثالی اِعتدال وتوازُن

اُسلامی معیشت کی دُوسری اہم خصوصیت اُس کا ''اِعتدال وتوازُن'' ہے، یوں تو یہ خصوصیت اِسلام کی تمام ہی تعلیمات میں، خواہ وہ زندگی کے کسی بھی شعبے سے متعلق ہوں، نمایاں طور پر رَچی بسی ہے، کہ ہر شعبۂ زندگی میں اس کی تعلیمات نے اِنتہا پسندی سے گریز کیا ہے، مگر صرف معیشت کے حوالے سے دیکھا جائے تو اس میں بھی یہ خصوصیت قدم قدم پر نمایاں ہے، یہاں صرف دو مثالیں عرض کرتا ہوں، جو اِس سلسلے میں بنیادی اور اُصولی اہمیت رکھتی ہیں۔

''رَہبانیت'' اور ''مادّیت'' کے درمیان راہِ اِعتدال

ایک طرف ''رَہبانیت'' یعنی ترکِ دُنیا ہے، جسے بہت سے مذاہبِ عالم میں ''زُہد وتقویٰ'' کا معیار قرار دے دیا گیا ہے کہ تجارت وصنعت، اور معاشی سرگرمیوں کے ساتھ کوئی شخص نہ ''دِین دار'' ہوسکتا ہے نہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرسکتا ہے۔ دُوسری طرف ''مادّیت'' کی انتہاء پسندی ہے جس کا حال آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں، کہ وہاں صرف دُنیا ہی دُنیا ہے، آخرت کا اور حلال وحرام کا کوئی تصور وہاں نہیں۔ معاشیات کے حوالے سے بھی ''مادّیت'' کا حاصل یہ ہے کہ معاش ہی انسان کا اصل بنیادی مسئلہ، اور معاشی ترقی ہی اس کی زندگی کا منتہائے مقصود ہے۔

برخلاف اسلام کی فطری تعلیمات کے کہ اس میں دِین اور دُنیا کو اس اِعتدال وتوازُن کے ساتھ جمع کیا گیا ہے کہ اِن پر عمل کرتے ہوئے اِنسان دِین اور دُنیا دونوں میں ترقی کی منازل طے کرسکتا ہے، چنانچہ اسلام ''رَہبانیت'' کا بھی مخالف ہے، اور ''مادّیت''

کا بھی۔ وہ ایک طرف تو رَہبانیت کے برخلاف انسان کی معاشی کارگزاریوں کو جائز، پسندیدہ، بلکہ ایک حدتک واجب قرار دیتا ہے، جس کی تفصیل آگے آئے گی، اور دُوسری طرف وہ مادّیت کے برعکس یہ حقیقت بھی پوری اہمیت کے ساتھ واضح کرتا ہے کہ معاشی سرگرمیاں تجارت وصنعت اور مزدوری وملازمت وغیرہ ضروری اور ناگزیر سہی، لیکن وہ انسان کی زندگی کا اصل مقصد نہیں، بلکہ راستے کے مرحلے ہیں، اصل مقصد بلندیٔ کردار ہے، جس کے نتیجے میں آخرت کی مسرتوں سے بھرپور دائمی زندگی جنت میں ملنے والی ہے۔ انسان کا اصل مسئلہ اور اس کی زندگی کا بنیادی مقصد اسی منزل کو حاصل کرنا ہے، لیکن چونکہ اس منزل کو دُنیا کی شاہراہ سے گزرے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا، اس لئے وہ تمام چیزیں بھی انسان کے لئے جائز، پسندیدہ یا ضروری ہوجاتی ہیں جو اس کی دُنیاوی زندگی کے لئے ناگزیر یا مفید ہیں۔

چنانچہ دُنیا کا جو مال ودولت، ساز وسامان اور جائیداد اِنسان کی اصل منزل کے لئے زادِ راہ کا کام دے اس کو قرآنِ حکیم نے "فَضْلُ اللّٰہِ" (اللہ کا رزق) "زِیْنَۃَ اللّٰہِ" (اللہ کی دی ہوئی زینت) اور "سَکَنٌ" (سکون واطمینان کی جگہ) جیسے اِحترامی القاب دیئے ہیں۔ اور دُنیا کے جس مال ودولت اور ساز وسامان میں انسان ایسا اُلجھ کر رہ جائے کہ اُن پر اپنی منزلِ مقصود ہی کو قربان کرڈالے، یا اس کے راستے میں رُکاوٹ بنادے، تو ایسے وسائلِ معاش کو قرآنِ حکیم "مَتَاعُ الْغُرُوْرِ" (دھوکے کا سامان) اور "فِتْنَۃٌ" قرار دیتا ہے ——— خلاصہ یہ کہ معیشت کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر "رَہبانیت" اور "مادّیت" کے بیچوں بیچ ہے کہ وسائلِ معاش اور معاشی سرگرمیاں پسندیدہ اور ایک حدتک ضروری تو ہیں، لیکن مقصدِ زندگی نہیں، مقصدِ زندگی قرآنِ حکیم نے یہ بتلایا ہے کہ:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۝۵۶

اور میں نے جن اور اِنسان کو (دراصل) اسی لئے پیدا کیا ہے کہ وہ
میری بندگی (عبادت اور اِطاعت) کریں (تاکہ آخرت کی کامیابی

انہیں حاصل ہو)۔ (سورۂ ذاریات:۵۶)

نظامِ سرمایہ داری اور سوشلزم کے درمیان راہِ اعتدال

موجودہ دُنیا نے دو متضاد معاشی نظاموں کا تجربہ کیا ہے، ایک طرف نظامِ سرمایہ داری (Capitalism) ہے، جو نجی ملکیت کی بے لگام آزادی کا قائل ہے، دُوسری طرف کمیونزم اور سوشلزم ہے (یا کچھ پہلے تک تھا) جو وسائلِ معاش کی نجی ملکیت ہی کا سرے سے مخالف ہے۔

اسلام کی شاہراہ اِن دونوں اِنتہاؤں کے درمیان ہے کہ وہ سوشلزم کے برخلاف وسائلِ معاش پر بھی نجی ملکیت کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے، بلکہ حکومت اور پورے معاشرے پر اس کے اِحترام وتحفظ کی ذمہ داری عائد کرتا ہے، مگر اس ملکیت کو نظامِ سرمایہ داری کے برعکس اتنا بے لگام نہیں ہونے دیتا کہ وہ معاشرے میں بے راہ روی اور نااِنصافیوں کا ذریعہ بن جائے۔

اس اِعتدال کی کچھ تفصیل ـــــ دولت اور ملکیت کی حقیقت

اس اِعتدال کی ضروری تفصیل میرے والدِ ماجد مفتیٔ اعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تصنیف ''اسلام کا نظامِ تقسیمِ دولت'' میں بڑی خوبی سے بیان فرمائی ہے۔[1] اسے یہاں بعینہٖ نقل کرتا ہوں، صرف اتنے لفظی فرق کے ساتھ کہ ایک دو جگہ مشکل لفظ کی جگہ ناچیز نے آسان لفظ لکھ دیا ہے، اور کہیں بریکٹ میں وضاحت کے لئے کوئی لفظ بڑھا دیا ہے ـــــ فرماتے ہیں:

> ''قرآنِ کریم کی تصریح کے مطابق دولت خواہ کسی شکل میں ہو، اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ، اور اَصلاً اُسی کی ملکیت ہے، انسان کو کسی چیز پر ملکیت کا جو حق حاصل ہوتا ہے، وہ اللہ ہی کی عطا سے ہوتا ہے، سورۂ

---

[1] اسلام کا نظامِ تقسیمِ دولت ص:۱۱ تا ۱۵۔

نور میں قرآنِ کریم کا اِرشاد ہے:

وَاٰتُوْهُمْ مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْٓ اٰتٰىكُمْ ۭ (۳۳:۲۴)

''اور انہیں (محتاجوں کو) اللہ کے اس مال میں سے دو جو اس نے تم کو عطا کیا ہے۔''

اس کی وجہ بھی قرآنِ کریم نے ایک دُوسری جگہ بتلا دی ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ یہی تو کرسکتا ہے کہ عملِ پیدائش میں اپنی کوشش صَرف کرے، لیکن اس کوشش کو بارآور کرنا، اور اس سے پیداوار کا مہیا کرنا خدا کے سوا کون کرسکتا ہے؟ انسان کے بس میں اتنا ہی تو ہے کہ وہ زمین میں بیج ڈال دے، لیکن اس بیج کو کونپل، اور کونپل کو درخت بنانا تو کسی اور ہی کا کام ہے، ارشاد ہے:

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ﴿٦٣﴾ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗٓ اَمْ نَحْنُ الزّٰرِعُوْنَ ﴿٦٤﴾

(۶۳:۵۶)

''دیکھو تو جو کچھ تم کاشت کرتے ہو، کیا تم اُسے اُگاتے ہو یا ہم ہیں اُگانے والے۔''

اور سورۂ یٰسٓ میں ہے:

لِيَاْكُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖ ۙ وَمَا عَمِلَتْهُ اَيْدِيْهِمْ ۭ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ ﴿٣٥﴾ (۳۶:۳۵)

''یعنی ہم نے زمین میں چشمے جاری کیے تاکہ وہ درختوں کے پھل کھائیں، حالانکہ یہ پھل اُن کے ہاتھوں نے نہیں بنائے، سو کیا وہ شکر نہیں کرتے۔''

نیز اِرشاد ہے:

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ ﴿٧١﴾

(سورۂ یٰسٓ)

''کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہیں کی کہ ہم نے ان کے لئے جانوروں کو اپنے ہاتھ (قدرت) سے بنا کر پیدا کیا، پھر یہی لوگ اُن کے مالک بن رہے ہیں۔''

یہ تمام آیات اس بنیادی نکتے پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالتی ہیں کہ دولت، خواہ کسی شکل میں ہو، اصلاً اللہ کی پیدا کردہ اور اُسی کی ملکیت ہے، اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ جس کو عطا کر دیتے ہیں وہ اس کا مالک بن جاتا ہے۔ اور آخری آیت میں جہاں یہ بتلایا گیا ہے کہ ہر چیز کا اصل خالق اور مالک اللہ تعالیٰ ہے وہیں ''فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ'' فرما کر بعطاء حق تعالیٰ انسان کی اِنفرادی ملکیت کو بھی واضح طور پر قائم کر دیا ہے۔ پھر اِسلام کی نظر میں چونکہ ''دولت'' پر اَصل ملکیت اللہ کی ہے، اور اسی نے انسان کو اس میں تصرف کرنے کا حق عطا کیا ہے، اس لئے اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس دولت پر اِنسان کے تصرفات کو اپنی مرضی اور اپنے مصالح کا پابند بنائے۔ چنانچہ انسان کو اپنی زیرِ تصرف اشیاء پر ''ملکیت'' تو حاصل ہے، مگر یہ ملکیت آزاد، خودمختار اور بے لگام نہیں ہے، اس پر ''دولت'' کے اصل مالک کی طرف سے کچھ حدود وقیود اور پابندیاں عائد ہیں، جس جگہ وہ اس دولت کو خرچ کرنے کا حکم دیدے، وہاں اس کے لئے خرچ کرنا ضروری ہے، اور جہاں خرچ کرنے کی ممانعت کر دے، وہاں رُک جانا لازم ہے، اسی بات کو سورۂ قصص میں زیادہ وضاحت کے ساتھ کھول دیا گیا ہے:

وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِى الْاَرْضِ (۲۸:۷۷)

"جو (کچھ) تجھ کو اللہ نے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر کما لے اور دُنیا سے اپنا حصہ نہ بھول، اور بھلائی کر جیسے اللہ نے تجھ سے بھلائی کی، اور ملک میں خرابی ڈالنی مت چاہ۔"

اس آیت نے اسلام کے فلسفۂ ملکیت کو خوب کھول کر بیان فرمادیا ہے، اس سے مندرجہ ذیل ہدایات واضح طور پر سامنے آتی ہیں:

(۱) انسان کے پاس جو کچھ دولت ہے، وہ اللہ کی دی ہوئی ہے (اٰتٰىكَ اللّٰهُ)۔

(۲) انسان کو اس کا اِستعمال اس طرح کرنا ہے کہ اس کی منزلِ مقصود دارِ آخرت ہو (وَابْتَغِ فِيْمَآ اٰتٰىكَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ)۔

(۳) چونکہ دولت اللہ کی دی ہوئی ہے، لہٰذا اس پر اِنسان کا تصرف حکمِ خداوندی کے تابع ہوگا، اب حکمِ خداوندی کی دو شکلیں ہیں، ایک یہ کہ وہ انسان کو اس بات کا حکم دے کہ مال کا کوئی حصہ کسی دُوسرے کو دے دو، اس کی تعمیل اس لئے ضروری ہے کہ اللہ نے تم پر اِحسان کیا ہے، تو وہ تمہیں دُوسرے پر اِحسان کا حکم دے سکتا ہے (وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ)۔

(۴) دُوسری شکل یہ ہے کہ وہ تم کو اس دولت کے تصرف سے منع کرے، اس کا بھی اس کو اِختیار ہے، کیونکہ وہ تمہیں دولت کے کسی ایسے اِستعمال کی اجازت نہیں دے سکتا جس سے اِجتماعی خرابیاں پیدا ہوں، اور زمین میں شر وفساد پھیلے (وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ)۔

یہی وہ چیز ہے جو اِسلام کو سرمایہ داری اور اِشتراکیت دونوں کے نظریۂ ملکیت سے ممتاز کرتی ہے، سرمایہ داری کا ذہنی پس منظر چونکہ

نظری یا عملی طور پر مادّیت ہے، اس لئے اس کے نزدیک انسان کو اپنی دولت پر آزاد اور خود مختار ملکیت حاصل ہے، وہ اس کو جس طرح چاہے صَرف کرسکتا ہے، لیکن قرآنِ کریم نے قومِ شعیب علیہ السلام کا ایک مقولہ نقل فرماتے ہوئے اس نظریے کا مذمت کے پیرائے میں ذکر کیا ہے، وہ لوگ کہا کرتے تھے:

''اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا'' (۸۷:۱۱)

''کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کا حکم دیتی ہے کہ ہم اپنے باپ دادوں کے معبودوں کو چھوڑ دیں، یا اپنے اموال میں اپنی مرضی کے مطابق تصرف کرنا ترک کردیں؟''

وہ لوگ چونکہ ''اموال'' کو حقیقۃً ''اپنا'' (اَمْوَالِنَا) سمجھتے تھے، اس لئے ''نَّفْعَلَ...مَا نَشٰٓؤُا'' (جو چاہیں کریں) کا دعویٰ اس کا لازمی نتیجہ تھا، یہی فکر سرمایہ داری کی رُوح ہے اور قرآنِ کریم نے سورۂ نور میں اپنے اموال "اَمْوَالِنَا" کے لفظ کو "مَالِ اللهِ" (اللہ کا مال) سے بدل کر سرمایہ دارانہ فکر کی اسی بنیاد پر ضرب لگائی ہے، مگر اس کے ساتھ ہی "الَّذِیْٓ اٰتٰکُمْ" (جو تمہیں دیا ہے) کی قید لگا کر اِشتراکیت کی بھی جڑ کاٹ دی ہے جو سرے سے انسان کی اِنفرادی ملکیت ہی کا اِنکار کرتی ہے۔

اب اسلام، سرمایہ داری اور اِشتراکیت کے درمیان واضح خطِ اِمتیاز اس طرح کھینچا جاسکتا ہے کہ:

سرمایہ داری ـــــ آزاد اور خود اِنفرادی ملکیت کی قائل ہے۔

اِشتراکیت ـــــ اِنفرادی ملکیت کا سرے سے اِنکار کرتی ہے۔

اور حق ان دو اِنتہاؤں کے درمیان ہے، یعنی:

اسلام ـــــــ اِنفرادی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے، مگر یہ ملکیت آزاد اور خودمختار نہیں، جس سے "فساد فی الارض" پھیل سکے۔"

(اقتباس ختم ہوا)

***

(۳)

معاشی سرگرمیاں بھی دِین کا اہم حصہ ہیں

اسلامی معیشت کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ مال و دولت کمانا، صنعت وتجارت، زراعت و کاشت کاری اور مزدوری و ملازمت اِسلام کی نظر میں محض دُنیاداری نہیں ہے، یہ بھی دِین کا ایک اہم حصہ ہے، اور دو شرطوں کے ساتھ یہ بھی عبادت بن جاتا ہے، ایک یہ کہ نیت دُرست ہو، مثلاً سوال کی ذِلت سے بچنے کے لئے کمائے، اور خود اپنی جان کے حقوق اور دُوسروں کے جو حقوق اس کے ذمے ہیں ان کی ادائیگی کی نیت سے کمائے۔ یا یہ نیت ہو کہ میری صنعت وتجارت اور محنت سے لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوں اور ملک وملت کو فائدہ پہنچے۔ بلکہ اگر ایک ہی عمل میں یہ تینوں نیتیں کرلی جائیں تو اس کا ثواب بھی تین گنا ہوجاتا ہے۔

اور دُوسری شرط یہ ہے کہ مال کمانے اور خرچ کرنے کا عمل شرعی حدود کے دائرے میں ہو، اس سے متجاوز نہ ہو۔ ان دو شرطوں کی موجودگی میں ہر عمل عبادت بن جاتا ہے، اور دُنیا و آخرت کی کامیابی کا ذریعہ بنتا ہے۔ یہ وہ بنیادی خصوصیت ہے جو اِسلام کو دُنیا کے تمام ادیان و مذاہب سے ممتاز کرتی ہے۔

اگر یہ بات مسلمان مزدور، مسلمان صنعتکار اور مسلمان تاجر و ملازم کے دِل میں اچھی طرح سما جائے تو معاشیات کے میدان بلکہ پورے معاشرے میں وہ خوشگوار اِنقلاب رُونما ہوگا کہ مادّی معیشت کے موجودہ نظاموں، اور دُوسرے اَدیان و مذاہب میں اس کا تصوّر ہی نہیں کیا جاسکتا۔

اس سلسلے کی بہت سی آیات واحادیث میں سے چند یہ ہیں:

(۱) قرآنِ کریم میں حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں ارشاد ہے کہ:

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾ (سورۃ الانبیاء)

"اور ہم نے ان کو (لوہے کی) زرہ (بنانے) کی صنعت تمہارے (نفع کے) لئے سکھائی، تاکہ وہ (زرہ) تم کو (جنگ میں) ایک دُوسرے کی زَد سے بچائے۔ تو کیا تم (اس نعمت کا) شکر کروگے بھی (یا نہیں)؟"

اس آیت میں زرہ سازی کی صنعت داؤد علیہ السلام کو سکھانے کی حکمت یہ بتلائی گئی ہے کہ "وہ زرہ تم کو تلوار وغیرہ کی زد سے محفوظ رکھ سکے" اور اس صنعت کے سکھانے کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک اِنعام قرار دِیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس صنعت کے ذریعے لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوں، اس کا سیکھنا سکھانا باعثِ ثواب ہے، بشرطیکہ نیت خدمتِ خلق کی ہو، یا ان نیتوں میں سے کوئی نیت جن کا ذِکر پیچھے آچکا ہے۔

(۲) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے کہ:

"مَا اَكَلَ اَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِّنْ اَنْ يَّاْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهٖ، وَاِنَّ نَبِيَّ اللهِ دَاوٗدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدِهٖ۔"

"ہر شخص جو کھانا اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھائے (اللہ کے نزدیک) اس سے بہتر کوئی کھانا نہیں۔ اور اللہ کے نبی داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔"[۱]

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب البیوع، حدیث: ۲۰۷۲ و ۲۰۷۳۔

(۳) نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"طلب الحلال واجب علی کل مسلم"

''حلال (کمانے) کے لئے کوشش کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔''[۱]

(۴) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی نے اس کوشش کی یہ حد مقرّر فرمائی کہ:

"اَنَّهٗ لَيْسَ مِنْ نَّفْسٍ تَمُوْتَ حَتّٰى تَسْتَوْفِيَ رِزْقَهَا، فَاتَّقُوا اللهَ، وَاَجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ وَلَا يَحْمِلَنَّكُمْ اِسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ اَنْ تَطْلُبُوْهُ بِمَعَاصِي اللهِ۔"

''کسی جاندار کو اس وقت تک موت نہیں آئے گی جب تک کہ وہ اپنا رِزق (جو اس کے مقدّر میں ہے) پورا نہ حاصل کرلے۔ پس تم اللہ سے ڈرو، اور (مال کمانے کی) کوشش میں میانہ روی اور اِعتدال سے کام لو، کہیں ایسا نہ ہو کہ رِزق کے لئے جلد بازی تم کو اس پر آمادہ کردے کہ تم اسے اللہ کی نافرمانیوں سے حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگو۔''[۲]

---

[۱] اوسط الطبرانی حدیث نمبر ۸٦١٠ ج:۸ ص:۲۷۲، وکذا فی مجمع الزوائد ج:۱۰ ص:۲۹۱۔

[۲] رواهُ ابن ابی شیبة فی مصنَّفه عن ابن مسعود رضی الله عنه، رقم الحدیث:۳۵۴۷۳، کتاب الزهد۔ والحاکم فی المستدرك رقم الحدیث:۲۱۳٦، کتاب البیوع ج:۲ ص:۵۔ ورواهُ الحاکم عن جابر رضی الله عنه نحوهٗ رقم الحدیث:۲۱۳۴-۲۱۳۵، کتاب البیوع ج:۲ ص:۴۔ وقال الذهبی فی التلخیص: "علی شرط البخاری ومسلم"۔ وابن حبان فی صحیحه رقم الحدیث:۳۲۳۹ ج:۸ ص:۳۳، باب ما جاء فی الحرص۔ والبیهقی فی شعب الإیمان رقم الحدیث:۱۱۸٦ ج:۲ ص:٦۷ ورقم الحدیث:۱۰۵۰۵ ج:۷ ص:۳۳۹، باب التوکل والتسلیم، وبابٌ فی الزُّهد وقصر الأمل۔

(۵) دیانت دار تاجروں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت دی کہ:

"اَلتَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الْاَمِیْنُ مَعَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ"[۱]

"سچا تاجر جو اَمانت دار ہو، وہ (آخرت میں) انبیائے کرام اور صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔"[۲]

(۶) اور بددیانت تاجروں کے بارے میں یہ ہولناک وعید سنائی کہ:

"اِنَّ التُّجَّارَ یُبْعَثُوْنَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ فُجَّارًا اِلَّا مَنِ اتَّقٰی وَبَرَّ وَصَدَقَ"

"تاجروں کا حشر قیامت کے دن نافرمانوں والا ہوگا، سوائے اُن کے جنہوں نے (تجارت میں) تقویٰ اِختیار کیا، اور قسم پوری

---

[۱] رواہُ الترمذی عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ وقال: "ھٰذا حدیث حَسَنٌ" رقم الحدیث: ۱۲۰۹ ج:۲ ص:۴۹۸، باب ماجاء فی التُّجَّار، ابواب البیوع۔ ورواہُ الدارمی، رقم الحدیث: ۲۵۳۹، باب التاجر الصدوق، کتاب البیوع۔ والدارقطنی فی سننہٖ، رقم الحدیث: ۱۸ ج:۳ ص:۷۔ وعبد بن حُمَید فی مُسندہٖ، رقم الحدیث: ۹۶۶ ج:۱ ص:۲۹۹۔

[۲] یہ مطلب نہیں کہ اس کا درجہ انبیائے کرام علیہم السلام کے برابر ہوجائے گا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اُن کے ساتھ ہوگا، اگرچہ درجہ یقیناً ان سے بہت کم ہوگا، جیسے کوئی معمولی افسر شاہی محل کے کسی حصے میں رہتا ہو۔ یا جیسے کوئی بادشاہ کسی بزرگ کی دعوت کرے اور ان کے ساتھ اُن کے خادموں کی بھی ضیافت کرے، تو اگرچہ کھانا اور کھانے کی جگہ ایک ہی ہو، لیکن جو درجہ بادشاہ کے نزدیک اُن بزرگ کا ہوگا وہ خادموں کا نہیں۔ مگر یہی کتنا بڑا اِعزاز ہے کہ وہ ان بزرگ کے ساتھیوں میں شامل ہیں۔ (کذا فی بہشتی زیور، ضمیمہ حصہ پنجم ص:۶۲)۔

کی، اور سچ بولا۔“[۱]

(۷) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو ہدایت فرمائی کہ:

"اِذْهَبْ فَاحْتَطِبْ وَبِعْ ـــــ فَقَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: هٰذَا خَيْرٌ لَكَ مِنْ اَنْ تَجِيْءَ الْمَسْئَلَةُ نُكْتَةً فِيْ وَجْهِكَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ"

”جا اور لکڑیاں جمع کر کے فروخت کر، پھر (وہ چلا گیا، لکڑیاں لاتا اور بیچتا رہا، کچھ دنوں بعد حاضر ہوا تو دس دِرہم کما چکا تھا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”یہ تیرے لئے اس سے بہتر ہے کہ (لوگوں سے خیرات) مانگنا تیرے چہرے پر قیامت کے دن (ذِلت کا) ایک داغ بن کر ظاہر ہو۔“[۲]

خلاصہ یہ کہ صنعت و مزدوری اور تجارت و ملازمت اور زراعت و کاشتکاری بھی دِینِ اسلام کا اہم حصہ ہیں، ان کاموں کو اگر صحیح نیت کے ساتھ شرعی حدود میں انجام دیا جائے تو یہ بھی عظیم عبادت بن جاتے ہیں۔

(۸) حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ: میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ

---

[۱] رواهُ الترمذی عن رفاعة بن رافع الأنصاری رضی الله عنه، كتاب البيوع، باب ماجاء فی التغليظ فی الكذب، وقال "هٰذا حديث حسن صحيح"۔ وابن ماجة ابواب التجارات حديث: ۲۱۶۲، والدارمی باب فی التجارة حديث: ۲۵۴۱، والبيهقی، كتاب البيوع، باب كراهية اليمين فی البيع ج:۵ ص:۲۶۶، والحاكم فی المستدرك وقال الذهبی فی التلخيص: "صحيح"۔ ورواهُ البيهقی فی شعب الإيمان عن البراء بن عازب رضی الله عنه، حديث نمبر: ۴۸۴۸، ج:۴ ص:۲۱۹۔

[۲] ابوداوٗد، كتاب الزكوة، باب ماتجوز فيه المسئلة، وابن ماجة، باب بيع المزايدة حدیث نمبر ۲۲۱۶۔

وسلم سے درخواست کی کہ میرے لئے دُعا فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری ساری دُعائیں قبول فرمالیا کرے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اَطِبْ كَسْبَكَ تُجَبْ دَعْوَتُكَ۔ فَإِنَّ الرَّجُلَ ليرفعُ اللُّقْمَةَ مِنَ الْحَرَامِ اِلٰى فِيْهِ فَلَا يُسْتَجَابُ لَهُ دَعْوَةٌ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا"

''اپنی کمائی کو (حرام سے) پاک صاف رکھو تو تمہاری دُعا قبول ہوگی، اس لئے کہ آدمی اگر حرام کا لقمہ اپنے منہ کی طرف اُٹھاتا (کھاتا) ہے تو اس کی کوئی دُعا چالیس دن تک قبول نہیں ہوتی۔''[۱]

اسلامی معیشت کی اس خصوصیت کی مزید تفصیلات آگے اس کتاب کے دُوسرے باب میں آئیں گی۔

[۱] فردوس دیلمی، حدیث نمبر ۸۴۴۶ ج:۵ ص:۳۶۳۔ وعمدۃ القاری ج:۱۱ ص:۱۷۴۔ والکبائر للحافظ الذہبی ج:۱ ص:۱۱۸۔ اسی مضمون کی حدیث حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت سے بھی فردوسِ دیلمی اور اوسط طبرانی میں آئی ہے، مگر بعض ائمہ حدیث نے اُس کی سند میں کچھ کلام کیا ہے۔

(۴)

اللہ کے سامنے یکساں جواب دہی

اسلامی معیشت کی چوتھی اہم اور بنیادی خصوصیت قرآنِ حکیم کا یہ فرمان ہے کہ:

''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ ۟ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِکُمْ رَحِیْمًا ﴿۲۹﴾ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِیْہِ نَارًا ؕ''

(سورۃ النساء)

''اے ایمان والو! آپس میں ایک دُوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ، مگر یہ کہ (جائز طور پر ہو، مثلاً) کوئی تجارت باہمی رضامندی سے ہو، اور نہ ایک دُوسرے کو قتل کرو، بلاشبہ اللہ تم پر مہربان ہے (اسی لئے مضر کاموں سے تمہیں منع فرمادیا ہے)۔ اور جو شخص ایسا کرے گا ہم اس کو عنقریب (دوزخ کی) آگ میں ڈالیں گے۔''

''دُوسرے کا مال ناحق (باطل) طور پر کھانے'' میں وہ تمام صورتیں داخل ہیں جو شرعاً ممنوع اور ناجائز ہیں، مثلاً چوری، ڈاکا، غاصبانہ قبضہ، بدعہدی، خیانت، دھوکا بازی، رشوت، سٹہ، اور سود و قمار، جن کی کچھ تفصیل قرآنِ کریم کی دُوسری آیات میں آگئی ہے، مزید تفصیلات رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی احادیث میں اِرشاد فرمائیں، پھر ان کی جزئیات فقہِ اسلامی میں مدوّن کردی گئیں۔

اس آیت کے پہلے جملے میں ناحق اور ناجائز طریقوں سے کسی کے مال میں

تصرف کرنے کو حرام کیا گیا ہے، دُوسرے جملے میں جائز طریقوں سے ''تجارت'' کا جواز بیان فرمایا گیا ہے، اس شرط کے ساتھ کہ وہ ہر دو فریق کی باہمی رضامندی سے ہو، یعنی دُوسروں کا وہ مال حرام نہیں جو بذریعہ تجارت باہمی رضامندی سے حاصل کیا گیا ہو۔

دُوسرے کا مال جائز طریقے سے لینے کے طریقے اگرچہ تجارت کے علاوہ اور بھی ہیں، جن کا جواز دُوسری آیات واحادیث سے ثابت ہے۔ مثلاً کوئی اپنا مال دُوسرے کو بلا معاوضہ ہدیہ یا تحفہ کے طور پر اپنی خوشی سے دیدے، تو لینے والے کے لئے وہ حلال ہوگا، لیکن عام طور سے دُوسرے کا مال لینے کی جائز صورت جو زیادہ رائج ہے، اور جس کی ضرورت زیادہ پیش آتی ہے، تجارت ہی ہے، اس لئے اسے یہاں خاص طور پر ذِکر فرمایا گیا ہے۔

پھر ''تجارت'' کے معنی عام طور سے اگرچہ صرف خرید وفروخت[1] کے لئے جاتے ہیں، مگر شریعت کی رُو سے ملازمت ومزدوری، اور کرایہ داری کے معاملات بھی ''تجارت'' میں داخل ہیں،[2] کیونکہ خرید وفروخت میں مال کے بدلے مال حاصل کیا جاتا ہے، اور ملازمت ومزدوری میں محنت وخدمت کے بدلے مال حاصل ہوتا ہے، لفظ ''تجارت'' ان دونوں کو شامل ہے۔ اور دونوں کے جواز کے لئے فریقین کی باہمی رضامندی شرط ہے۔ باہمی رضامندی کے بغیر نہ خرید وفروخت دُرست ہوتی ہے، نہ ملازمت ومزدوری، اور اس طرح حاصل کیا ہوا مال حلال بھی نہیں ہوتا۔

خلاصہ یہ کہ اس آیت میں تمام مسلمانوں کو خطاب ہے، جس میں تاجر بھی داخل ہیں گاہک بھی، صنعتکار اور مزدور بھی شامل ہیں، اور زمیندار وکاشتکار بھی، اور ہر ایک پر دُوسرے کا مال ناحق (باطل) طور پر لینے یا دبا لینے یا اس میں مالکانہ تصرف کو حرام قرار دِیا گیا ہے، اور اس پر جہنم کے عذاب کی خبر دی گئی ہے۔

---

[1] شرعی اِصطلاح میں خرید وفروخت کو ''بیع'' اور ملازمت ومزدوری اور کرایہ داری کو ''اِجارہ'' کہا جاتا ہے، لفظ تجارت دونوں کو شامل ہے۔

[2] تفسیر معارف القرآن ج:۲ ص:۳۷۸ بحوالہ تفسیر مظہری۔

صنعتکار کی طرف سے مزدور یا ملازم کا مال ناحق کھا جانے میں جس طرح یہ داخل ہے کہ وہ کام تو پورا لے مگر اُجرت و تنخواہ پوری نہ دے، اسی طرح یہ بھی داخل ہے کہ جو مزید مالی معاوضے اور الاؤنس وغیرہ اور سہولتیں معاہدۂ ملازمت میں طے شدہ ہوں، مثلاً پراویڈنٹ فنڈ، پنشن، گریجویٹی، اور پارٹی سپیشن فنڈ، وغیرہ ان کی ادائیگی ناحق طور پر روک دے۔

اور مزدور و ملازم کی طرف سے صنعتکار کا مال ناحق طور پر کھا جانے میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ مقرّرہ اُجرت والاؤنس وغیرہ پورا لینے کے باوجود اپنی ڈیوٹی پوری نہ کرے، کہ یا تو مقرّرہ وقت ہی پورا نہ لگائے، یا محض خانہ پُری کی جائے کام صحیح طریقے سے نہ کرے، مثلاً اپنے ذاتی کاموں یا گپ شپ میں ڈیوٹی کا کچھ یا پورا وقت گزار دیا جائے، یا کارخانے کی اسٹیشنری یا دیگر سامان، مالک کی اجازت کے بغیر اپنے ذاتی اِستعمال میں لے آئے، یا کارخانے کی مشینوں وغیرہ کو جان بوجھ کر نقصان پہنچایا جائے۔

غرض تمام عاقل و بالغ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہیں، قصداً جان بوجھ کر دُوسرے کی حق تلفی کرنا گناہِ کبیرہ ہے، جس پر آخرت میں جہنم کی سزا مقرّر ہے، اور دُنیا میں اس کے خلاف اسلامی ضابطۂ عدالت کے مطابق چارہ جوئی کا حق ہر فریق کو حاصل ہے۔

اس سلسلے میں قرآنِ حکیم کا یہ اِرشاد خصوصی توجہ کا طالب ہے کہ:

”إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ“

(سورۃ التوبۃ:۱۱۱)

”اللہ نے خرید لی ہیں مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے مال اس قیمت پر کہ ان کے لئے جنت ہے۔“

اگرچہ یہ آیت مجاہدینِ اسلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے، لیکن اس کے الفاظ کا عموم بتا رہا ہے کہ جب کوئی شخص ایمان لے آتا ہے تو اس کے ایمان کا تقاضا ہے کہ وہ اپنی

جان اور مال کو اللہ کے اَحکام کے تابع کردے جس کے عوض اسے جنت دینے کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ اللہ اور مؤمنین کے درمیان جو معاہدہ ہوا اسی کو یہاں ''خریداری'' کے الفاظ میں بیان فرمایا گیا ہے۔

گویا ہماری جان اور مال ایک مالِ تجارت ہے جسے اللہ نے جنت کے عوض خرید لیا ہے، جب مؤمنین کی جانیں بھی اللہ تعالیٰ نے خرید لی ہیں تو ہر مسلمان اَجیر (Labour) ہے اور اللہ ربّ العالمین اس کا ''مستاجر''۔ یہاں اس لحاظ سے صنعتکار اور مزدور کی تفریق مٹ جاتی ہے کہ صنعت کار بھی اَجیر ہے اور مزدور وملازم تو اَجیر ہے ہی، اور یہ دونوں ایک اللہ ربّ العالمین کے سامنے جوابدہ ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے یکساں جواب دہی کا یہ عقیدہ بھی اسلام کے اِن بنیادی اُصولوں میں سے ایک ہے جن کے بغیر دُنیا نہ حقیقی چین وسکون سے آشنا ہوسکتی ہے نہ فطری منصفانہ نظمِ معیشت یا پائیدار اَمن قائم ہوسکتا ہے، نہ اَجیر ومستاجر کے حقوق کا پورا تحفظ ممکن ہے۔

(۵)

وسائلِ معاش اور بازار کی آزادی

اسلامی معیشت کی پانچویں اور بنیادی خصوصیت ـــــ جسے یہاں کچھ تفصیل سے بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے، اور جس کے ضمن میں ہمیں نظامِ سرمایہ داری کا بھی تقابلی جائزہ لینا پڑے گا ـــــ "وسائلِ معاش اور بازار کی آزادی" ہے، یعنی اسلام ایک ایسا فطری اور قابلِ عمل نظامِ معیشت قائم کرنا چاہتا ہے جو وسائلِ معاش کی مصنوعی جکڑ بندیوں اور اِجارہ داریوں سے آزاد ہو، ذرائعِ معاش اتنے وافر ہوں کہ ہر انسان کسی جبر کے بغیر اپنی لیاقت واہلیت، اپنے سرمائے، اور اپنے اِختیار اور اپنی پسند کے مطابق حلال وحرام کی تمیز کے ساتھ کسبِ معاش کر سکے، اور اپنی خدمات کا مناسب صلہ پا سکے، تاکہ اس کی محنت، خدمات اور وسائل خود اس کے لئے اور معاشرے کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید اور بارآور ہوں، اور وہ ایک خوشحال معاشرے کی تعمیر میں مؤثر کردار ادا کر سکے۔

دو بڑی رُکاوٹیں ـــــ "اِرتکازِ دولت" اور "طلب ورسد" کی مصنوعی جکڑ بند

اس مقصد کی راہ میں سب سے بڑی رُکاوٹیں دو ہیں، ایک "اِرتکازِ دولت" (Concentration of Welth) یعنی سرمایہ اور وسائلِ پیداوار کا چند خاندانوں یا خاص خاص طبقات میں دائر اور محدود ہو جانا، اور باقی مخلوقِ خدا کا اُن کے رحم وکرم پر رہ جانا۔ اور دُوسری "طلب ورسد" (Demand and Supply) کی مصنوعی جکڑ بند، جن کی تفصیل آگے آئے گی۔ ان رُکاوٹوں کو دُور کئے بغیر اسلامی اُصولِ معیشت کا مقصد (عمومی خوش حالی

اور معاشی عدل وانصاف) حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ اسلام نے ان دونوں رُکاوٹوں کا قلع قمع کرنے کے لئے جو ہدایات دی ہیں اِن شاء اللہ آگے بیان ہوں گی لیکن اس سے پہلے ضرورت ہے کہ اس سلسلے میں دُوسرے معاشی نظاموں کا بھی بقدرِ ضرورت جائزہ لیا جائے۔

سوشلزم کی جکڑ بند

سوشلزم میں دولت کے تمام دہانوں، عواملِ پیداوار اور وسائلِ معاش، یعنی سرمایہ، زمین، زراعت، صنعت، کارخانوں اور ہر قسم کی تجارت پر، حتیٰ کہ افرادی قوت پر بھی حکومت (افسر شاہی) کا غاصبانہ قبضہ ہوتا ہے، جس میں ظاہر ہے کہ ''اِرتکازِ دولت'' اِنتہائی خوفناک شکل میں اپنے عروج پر ہوتا ہے۔ اور اس میں وسائلِ معاش اور ''طلب ورسد'' کی فطری قوتوں کی آزادی کا بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہ نظام چونکہ اپنی موت آپ مر چکا ہے، لہٰذا اب اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں رہی۔

نظامِ سرمایہ داری کے خوش نما جال اور عوام پر اُن کی گرفت

دُوسری طرف نظامِ سرمایہ داری (Capitalism) ہے، جس کا پیچ در پیچ پھندا سوشلزم کی موت کے بعد پاکستان سمیت دُنیا کے بیشتر ممالک پر تنگ سے تنگ ہوتا جارہا ہے، اس نظام میں یہ سارے مالی اور معاشی وسائل حکومت کے قبضے میں تو نہیں ہوتے، لیکن اس کا خود غرضانہ جال ایسی چالبازی سے بُنا گیا ہے کہ اس میں اَن دیکھے طریقے پر یہ وسائل سمٹ سمٹ کر چند اَفراد اور خاص خاص طبقات اور خاندانوں کے قبضے میں آجاتے ہیں، اور عوام کے پاس یہاں بھی محرومی اور بے کسی کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ سوشلزم میں عوام کے ساتھ یہ واردات بھونڈی کھلم کھلا زبردستی کے ذریعے ہوتی تھی تو نظامِ سرمایہ داری میں یہی واردات خوبصورت انداز میں، نظر نہ آنے والی زبردستی کے ذریعے کی جاتی ہے۔

نظامِ سرمایہ داری میں اِرتکازِ دولت بھی بہت اُونچی سطح پر ہوتا ہے اور ''طلب ورسد'' کی مصنوعی جکڑ بند بھی قدم قدم پر، بازار کی آزادی کا گلا گھونٹتی ہے۔ اس نظام میں سود، سودی بنکاری، جوا، سود و قمار پر مبنی انشورنس، سٹے، ناجائز آڑھت، اور ذخیرہ اندوزی

وغیرہ کے ذریعے ملک کی تقریباً پوری دولت چند افراد اور خاندانوں کے درمیان دائرہ ہو کر رہ جاتی ہے، جو "طلب و رسد" (Demand and Supply) کی فطری قوتوں کو بھی اپنے مفادات کے تابع کر کے بازار کی قیمتوں کے حاکم بن بیٹھتے ہیں، بیورو کریسی سے ان کا گٹھ جوڑ ہوتا ہے، دولت کے بل پر یہ صرف امپورٹ، ایکسپورٹ، تھوک مارکیٹ اور صنعت و تجارت ہی پر قابض نہیں ہوتے، بلکہ اسمبلیوں اور اِقتدار کے ایوانوں پر بھی یہی براجمان ہو جاتے ہیں، چھوٹے تاجر، دستکار، چھوٹے صنعتکار، اور عوام، سب ان کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں، عوام کی اکثریت اِن ہی کی مزدوری اور نوکری چاکری پر مجبور ہوتی چلی جاتی ہے، اور ان ہی کی من مانی شرائط پر، اور جو اُجرت وہ مقرّر کر دیں اُسی پر کام کرنے کے سوا عوام کے لئے کوئی چارۂ کار نہیں رہتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ تنخواہ دار طبقے کی آنے والی نسلیں بھی نوکری چاکری ہی کرتی رہتی ہیں اور معاشرہ دو طبقوں میں بٹ جاتا ہے، ایک طرف مال داروں کا طبقہ جس کی آنے والی نسلوں میں دولت بڑھتی جاتی ہے، دُوسری طرف وہ طبقہ جو انہی کی نوکری چاکری کرنے پر مجبور ہے۔ پھر چونکہ ملازمت کے مواقع کم اور اس کے طلب گار زیادہ ہوتے ہیں اس لئے وہ مستأجر (Entreprencur) کی من مانی شرائط پر اور اُسی اُجرت پر گزر بسر کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جو مستأجر ان کو دینے پر تیار ہو جائے۔ اَجیر کے پاس عملاً یہ اِختیار نہیں رہتا کہ وہ اپنے حسبِ حال ذریعۂ معاش کا اِنتخاب کر سکے، یا مستأجر سے ٹھوک بجا کر سودا کاری کر سکے۔ غریب پہلے سے زیادہ غریب، اور مال دار پہلے سے زیادہ مال دار ہوتے چلے جاتے ہیں۔ لہٰذا آگے جانے سے پہلے اس نظام کے بچھائے ہوئے جالوں کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اس نظام کا ایک بڑا جال ـــــ سودی بنکاری

نظامِ سرمایہ داری کا سب سے بڑا جال وہ بنکاری ہے جس کی بنیاد سود پر قائم ہے، اس کے ذریعے عوام کو بے وقوف بنا کر نہ صرف انتہائی بے دردی سے لوٹا جاتا ہے، بلکہ اُن

کی حقیقی آزادی بھی سلب کر لی گئی ہے۔ مختصراً اس کا ''طریقۂ واردات'' یہ ہے کہ عوام کو یہ سبز باغ دِکھایا جاتا ہے کہ: تم اپنی بچت کی رقمیں بنک میں جمع کراؤ، تو ہم تم کو گھر بیٹھے اس پر سالانہ ''نفع'' (سود) دیتے رہیں گے۔ یہ سود عموماً ٦ تا ٩ فیصد سالانہ ہوتا ہے، عوام جو بنک کے ''کھاتہ دار'' (Depositors) کہلاتے ہیں، اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی کی حفاظت کی خاطر اور سود کے لالچ میں، اپنی روزمرہ کی ضروریات سے بچی ہوئی تقریباً ساری رقمیں بنک میں جمع کراتے رہتے ہیں، اس طرح تقریباً پورے ملک کے عوام کی رقمیں بجائے اس کے کہ وہ تجارت اور چھوٹی چھوٹی صنعتوں اور معیشت کے دُوسرے نفع بخش کاموں میں براہِ راست لگتیں، ملک کے دُور دَراز علاقوں اور دیہات تک میں تجارت و دستکاری اور چھوٹی صنعتوں کے پروان چڑھنے کا ذریعہ بنتیں، چھوٹے سرمایہ والوں کی تجارت کے منافع سامنے آتے تو دُوسروں کا بھی حوصلہ بڑھتا، ہر ایک کا اسٹاف بھی کچھ نہ کچھ ہوتا، جس سے ہزاروں ضرورت مندوں کی روزی پیدا ہوتی، اس سب کے بجائے سود کے لالچ میں یہ تقریباً ساری رقمیں بنکوں کے قبضے میں چلی جاتی ہیں، اور اس طرح ہر بنک میں، خواہ وہ زرعی بنک ہو، یا صنعتی یا تجارتی، دولت کا ایک سمندر جمع ہو جاتا ہے۔ بنک کے مالکان گنے چنے افراد ہوتے ہیں اور ان کا اپنا سرمایہ بنک میں بہت کم ہوتا ہے، باقی سارا سرمایہ کھاتہ داروں کا فراہم کردہ ہوتا ہے، جس بنک کے پاس کھاتہ داروں کی رقمیں جتنی زیادہ ہوں وہ اتنا ہی کامیاب اور مالی طور پر اتنا ہی طاقتور سمجھا جاتا ہے، چنانچہ بنک ہی درحقیقت کسی ملک کے سب سے بڑے سرمایہ دار ہوتے ہیں۔

اگرچہ بنکوں کی ساری مال داری کھاتہ داروں کی مرہونِ منّت ہے، لیکن بنک کے اِنتظامی معاملات اور پالیسی میں ان کو کسی قسم کی مداخلت کا اِختیار نہیں ہوتا، کیونکہ انہوں نے بنک کو اپنی رقمیں سود کے لالچ میں بہ طورِ قرض دی ہیں، بنک کے نفع و نقصان میں حصے داری کی بنیاد پر نہیں دیں، چنانچہ تمام اِنتظامی اِختیارات بنک مالکان کے پاس ہوتے ہیں، وہی جن منتظمین کو جہاں مناسب سمجھیں مقرّر کرتے ہیں، وہی حساب کتاب کی نگرانی کرتے

ہیں، اور وہی ملک کے مرکزی بنک (مثلاً پاکستان میں اسٹیٹ بنک آف پاکستان، ہندوستان میں ''ریزرو بنک آف انڈیا'' اور برطانیہ میں ''بنک آف انگلینڈ'') کی قائم کردہ حدود میں یہ پالیسی متعین کرتے ہیں کہ کتنا کتنا سرمایہ کس کس کام میں کہاں کہاں لگایا جائے۔ سودی بنک اس سرمائے سے خود کوئی تجارت نہیں کرتے، بلکہ بڑے بڑے تاجروں، صنعتکاروں اور زمینداروں کو زیادہ شرحِ سود پر قرضے فراہم کرتے ہیں۔

بنک مختلف قسم کی خدمات انجام دیتا ہے، جن میں سے بعض مفید بھی ہیں اور جائز بھی، لیکن بنک کا اصل کام اور ''نفع'' کمانے کا سب سے بڑا ذریعہ ''ساہوکاری'' ہے کہ وہ کھاتہ داروں سے کم شرحِ سود پر روپیہ حاصل کرے اور زیادہ شرحِ سود پر کاروباری لوگوں یا سرکاری اِداروں کو قرضے دے۔ بنک کھاتہ داروں سے رقمیں عموماً ۸ فیصد سالانہ سود پر لیتے ہیں، اور ۱۸ تا ۲۲ فیصد سود پر آگے قرضے دیتے ہیں۔ اس طرح بنک کو سود تقریباً دس بارہ فیصد تو یوں بچ جاتا ہے، لیکن جیسا کہ آگے معلوم ہوگا بنک ایک ''کرتب'' کے ذریعے جو (Creation of Money) کہلاتا ہے، درحقیقت اس سے بھی کئی گنا سود کماتا ہے جو عام نظروں سے مخفی رہتا ہے۔

بنک سرمائے کا ایک حصہ روزمرہ کے لین دین کے لئے اپنے پاس رکھتا ہے، ایک حصہ مرکزی بنک (مثلاً پاکستان میں اسٹیٹ بنک) میں قانوناً رکھوانا پڑتا ہے، باقی سارا سرمایہ، یہ ساہوکار چن چن کر ایسے بڑے بڑے جاگیرداروں، ملوں کے مالکان، تاجروں اور سرکاری تجارتی اِداروں کو دیتا ہے جن سے قرض کی واپسی کے علاوہ مقرّر سود کی وصولیابی بھی یقینی ہو، یہی وجہ ہے کہ اِن بنکوں سے کسی چھوٹے تاجر یا دستکار کو یا عام غریب آدمی کو قرض ملنے کا کوئی اِمکان نہیں، خواہ اُس کے بچے فاقوں پر فاقے کر رہے ہوں یا اُس کے کسی جگر گوشے کی لاش بے گور و کفن پڑی ہو، اور چونکہ سود کی چاٹ میں اُس کے رشتے دار اور اہلِ تعلق بھی عموماً اپنی بچتیں بنکوں میں جمع کراتے ہیں لہٰذا اُن سے بھی اس غریب کو قرض ملنے کی توقع بہت کم ہوتی ہے۔ اسی طرح کسی ایسے تعلیمی، دِفاعی، ترقیاتی اور فلاحی منصوبے

کے لئے بھی جو ملکی اور عوامی ضروریات کے لئے خواہ کتنا ہی ناگزیر ہو ان بنکوں سے اس وقت تک قرض نہیں مل سکتا جب تک کہ ان کو مقرّرہ شرح پر سالانہ سود اَدا کرنے کا اِطمینان نہ دِلا دیا جائے، کیونکہ اِن ساہوکار بنکوں نے سارا ملکی سرمایہ کھینچا ہی اس لئے ہے کہ اس کے بَل بوتے پر وہ زیادہ سے زیادہ روپیہ بٹوریں، ان کی سود خور جبلت کو اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ پیسے کی ضرورت کس کو زیادہ ہے، یا کس منصوبے کے لئے قرض دینا ملک وملت کے لئے زیادہ مفید ہے، ان کی خود غرضانہ نظر صرف اور صرف اس پر ہوتی ہے کہ انہیں سود کون مقرّرہ شرح سے دے سکتا ہے، اِن کے نزدیک قرض لینے کا مستحق وہ فاقہ زدہ انسان نہیں جس کے بچے سسک سسک کر دن گزار رہے ہوں، متوسط طبقے کا وہ انسان بھی ان کی نظرِ کرم کا مستحق نہیں جو ملازمت کے بجائے قرض لے کر کوئی چھوٹی موٹی تجارت کرنا چاہتا ہے، یونیورسٹی کا وہ پروفیسر، سائنسدان، اور انجینئر بھی ان کے نزدیک راندۂ درگاہ ہے جو اپنی کسی اہم فنی تحقیق یا اِیجاد کو پروان چڑھانے اور ملک وملت کے لئے کارآمد بنانے کی خاطر قرض لینے کا محتاج ہے مگر مقرّرہ شرحِ سود کا ناپاک بوجھ اُٹھانے کے لئے تیار نہیں۔ وہ علمائے محققین، مصنفین اور اَدیب ودانشور بھی اِن کے نزدیک ناقابلِ اِلتفات ہیں جن کی فکری، قلمی کاوشیں دُنیائے علم وادب کا بیش بہا سرمایہ ہوتی ہیں، لیکن وہ محض اس لئے دیمک کی غذا بن جاتی ہیں کہ اُن کے پاس اپنی تصانیف کی طباعت واشاعت کے لئے سرمایہ نہیں ہوتا، اور سود دَر سود کا پھنکارتا ہوا سانپ وہ اپنے گلے میں ڈالنے کو تیار نہیں ہوتے، اور نہ اس کی ان میں سکت ہوتی ہے۔ ان ساہوکاروں کے نزدیک قرض لینے کے سب سے زیادہ مستحق وہ ارب پتی اور کروڑ پتی ہیں جو بنک کی سود خور ہوس کو چارہ دینے کی پوری صلاحیت رکھتے ہوں، اگرچہ وہ اس قرض سے نائٹ کلب، یا مار دھاڑ اور فحاشی وعریانی کو فروغ دینے والی فلمیں ہی تیار کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہوں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پوری قوم کا سرمایہ گنے چنے سرمایہ داروں کے درمیان دائر ہو کر رہ جاتا ہے۔

پھر ان کاروباریوں کو بھی بنک جو سرمایہ فراہم کرتے ہیں وہ اُن کے کاروبار میں

حصہ داری (مضاربۃ یا مشارکت) کی بنیاد پر نہیں ہوتا کہ کاروبار میں نفع ہو تو طے شدہ تناسب سے بنک کو بھی نفع ملے اور نقصان ہو تو اس نقصان کے اُٹھانے میں بھی بنک شریک ہو، بلکہ یہ خالص سودی قرضہ ہوتا ہے، لہٰذا کاروباریوں کو نفع ہو یا نقصان، بنک کا مقررّہ سود ہر حالت میں کھرا رہتا ہے۔

لہٰذا جو کاروباری لوگ بنک سے قرض لے کر زراعت یا صنعت وتجارت میں سرمایہ لگاتے ہیں ظاہر ہے کہ وہ اس کا سود اپنی گرہ سے نہیں دیتے، بلکہ اُسے اپنی پیداوار اور مالِ تجارت کی لاگت پر ڈالتے ہیں، جس کے نتیجے میں اِن اشیاء کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں، اور مہنگائی اپنے کئی دُوسرے اسباب کے ساتھ مل کر اُن کھاتہ داروں کا بھی خون چوسنے لگتی ہے جن کے فراہم کردہ سرمائے سے بنک نے یہ سارا کھیل کھیلا، اور کروڑ پتیوں کو اَرب پتی بننے کا موقع فراہم کیا ہے۔

ایک کرتب ــــ تخلیقِ زر (Creation of Money)

اِن بنکوں کا ایک ''کرتب'' وہ ہے جو ''تخلیقِ زر'' (Creation of Money) کہلاتا ہے، ''الٰہ دین کے اس چراغ'' سے وہ محض حسابی کتابی ہیر پھیر کے ذریعے حقیقی سو روپے کے کئی سو فرضی روپے بنالیتے ہیں، اور ان کو بھی حقیقی سرمایہ کی طرح قرضوں میں دے کر اُن پر بھی سود اُسی شرح سے وصول کرتے ہیں، اس طرح حقیقی سرمائے سے کئی گنے فرضی سرمائے کا سود بھی ان کے خزانے بھرتا رہتا ہے، اور یہ سارا سود بھی چونکہ کاروباریوں سے وصول کیا جاتا ہے، اور وہ اسے اپنی پیداوار کی لاگت پر ڈالتے ہیں، اس لئے اس کا سارا بوجھ بھی عوام ہی کو گردن توڑ مہنگائی کی صورت میں اُٹھانا پڑتا ہے، وہی عوام جن کو ۸ فیصد سود کا لالچ دے کر اُن کا سرمایہ سمیٹا گیا اور یہ سارا کھیل کھیلا گیا انہی پر مہنگائی کا بوجھ ۸ فیصد سے کہیں زیادہ لاد دیا گیا۔

بنک کو ''کرنٹ اکاؤنٹ'' اور ''فلوٹ'' (Float) کی شکل میں بہت سا سرمایہ

ایسا بھی ملتا ہے جس پر وہ سرمایہ فراہم کرنے والوں کو کوئی سود نہیں دیتا، مگر وہ اسے بھی اپنی سودخوری کا ذریعہ بناتا ہے، اور اس سود کی تان بھی بالآخر مہنگائی کی صورت میں اسی طرح عوام پر ٹوٹتی ہے جس طرح اُوپر عرض کیا گیا۔

ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جن عوام کے فراہم کردہ سرمائے سے بنکوں کی فلک بوس عمارتیں، مالکان اور افسروں کی شاہ خرچیاں، ساہوکاری کے یہ سارے ہتھکنڈے، اور ان کی ساری شان وشوکت قائم ہے، اُنہی غریب عوام کا فراہم کردہ سرمایہ انہی کے خلاف استعمال ہو رہا ہے، اس سے انہی کو کچلا جا رہا ہے، بنکوں نے اُن کو سود ۸ فیصد دِیا اور خود ۱۲ فیصد سے بھی کئی گنا زیادہ پر ہاتھ صاف کر گئے، ان بنکوں سے قرض لے کر اُسے کاروبار میں لگانے والوں نے بھی اس پر خوب نفع کمایا، بلکہ جو سود بنک کو دِیا تھا وہ بھی عوام ہی سے وصول کرلیا، رہے عوام، تو اُن کے حصے میں مہنگائی کا وہ زہریلا ناگ آیا جو نہ صرف اُن کو ملنے والے ۸ فیصد کو ہڑپ کرنے پر لگا ہوا ہے، بلکہ ان کی زندگیوں میں مزید اِفلاس کا زہر مسلسل گھولتا چلا جا رہا ہے۔ نظر آنے والے ہاتھ نے جتنا ان کو دِیا تھا، نظر نہ آنے والے ہاتھ نے اس سے کہیں زیادہ ان کی جیبوں سے کھینچ لیا۔

قومی ملکیت والے بنک

یہ تو اُن بنکوں کا مختصر سا حال ہے جو اَفراد کی نجی ملکیت ہیں، اور پرائیویٹ بنک کہلاتے ہیں، اور جو بنک ''قومی ملکیت'' میں کہلاتے ہیں، اُن میں بھی تقریباً وہی سارا کھیل کھیلا جاتا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ پرائیویٹ بنکوں میں عوام پر یہ واردات کرنے والے غیرسرکاری لوگ ہیں، اور ''قومی ملکیت'' والے بنکوں میں یہی واردات بیوروکریسی اور صاحبِ اِقتدار سیاست دانوں کی ملی بھگت سے انجام پاتی ہے۔

بلکہ پاکستان جیسے ملکوں میں تو اِن بنکوں کے سہارے یہ ڈاکازنی بھی اِنتہائی دھڑلے سے کی جاتی ہے کہ سیاسی اثر ورُسوخ رکھنے والے بڑے بڑے سرمایہ دار اِن

''قومی'' بنکوں سے اَربوں روپے کے قرضے حاصل کرکے، سیاسی رشوت کے طور پر حکومت سے معاف کرالیتے ہیں۔ یعنی اِن قومی بنکوں کو سود دینا تو درکنار، اُن کی اصل رقم ہی ہضم کر جاتے ہیں۔[1] اس کا بوجھ بھی ظاہر ہے قومی خزانے اور کھاتہ داروں پر پڑتا ہے جسے چھپانے کے لئے حکومت ٹیکسوں کے نئے انبار قوم پر لاد دیتی ہے، اور اِن ٹیکسوں کی تان بھی بالآخر ملازمت و مزدوری پیشہ طبقوں اور بے روزگار عوام پر ٹوٹتی ہے، کیونکہ تاجر طبقہ تو ٹیکسوں کا سارا لدان مالِ تجارت کی قیمتوں پر ڈال کر اپنا نفع پورا کرلیتا ہے۔

سودی بنکاری کا ایک اور حربہ

سودی بنکاری کی ایک اور تباہ کاری یہ ہے کہ جس شخص کا اپنا سرمایہ ایک کروڑ ہے اور وہ بنک سے سودی قرضہ لے کر دس کروڑ کا بیوپار کرتا ہے، اگر کسی وجہ سے تجارت میں نقصان ہوکر وہ دیوالیہ ہوگیا، تو غور کیجئے اس کا اپنا نقصان تو ایک کروڑ کا ہوا، باقی ۹ کروڑ کا گھاٹا بنک پر پڑا، اور بنک کا بیشتر سرمایہ چونکہ کھاتہ داروں کا دِیا ہوا ہے، اگر بنک بھی دیوالیہ ہوگیا تو یہ نقصان بھی کھاتہ داروں کے حصے میں آیا۔ اور اگر بنک دیوالیہ نہ بھی ہو اور یہ نقصان وہ خود برداشت کرلے، کھاتہ داروں پر نہ ڈالے تب بھی یہ بنک اگر قومی ملکیت میں ہے تو سارا نقصان قومی خزانے پر پڑے گا جس کی زد بالآخر غریب عوام ہی پر پڑتی ہے۔ حاصل یہ کہ بنک سے سودی قرضہ لے کر سرمایہ دار جب تک نفع کماتا رہا تو وہ اس کا تنہا مالک تھا، اس

---

[1] حالیہ برسوں میں اِن شرمناک واقعات کی خبریں ہمارے ذرائع ابلاغ میں بڑی بڑی سرخیوں اور مفصل اَعداد و شمار کے ساتھ آتی رہی ہیں، جن میں اُن مشہور سیاسی شخصیات کی نشاندہی بھی کی جاتی رہی ہے جنہوں نے قومی دولت پر اس طرح ہاتھ صاف کئے، مگر ان کے خلاف آج تک کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اَصحابِ اِقتدار اور ان عادی مجرموں کے گٹھ جوڑ نے پاکستان کے قانون میں کوئی ایسا چور دروازہ بنالیا ہے جس کے راستے اس قسم کے سنگین مالی جرائم کو قانونی جواز فراہم کردیا گیا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ رفیع ۲۹رجون ۲۰۰۹ء

میں عوام کا کوئی حصہ نہ تھا، اور جب گھاٹا آیا تو اس کا ۹۰ (نوے) فیصد عوام پر ڈال دیا گیا۔

دُنیا بھر کی غریب قوموں پر اس جال کی تباہ کاریاں

سرمایہ داری نظام اسی پر بس نہیں کرتا، بلکہ بیوروکریسی، سرمایہ دار طبقہ اور اس نظام سے پیدا ہونے والے سیاسی لیڈر، خوفِ آخرت سے بے نیاز ہوکر جونوچ کھسوٹ اپنے عوام سے کرتے ہیں وہی واردات طاقتور سرمایہ دار ممالک کمزور اور غریب ملکوں کے ساتھ دُہراتے ہیں۔ وہ غریب ملکوں کو طرح طرح کی سازشوں سے بیرونی خطرات اور اندرونی سیاسی خلفشار میں اس بُری طرح اُلجھا دیتے ہیں کہ وہ ان سے سودی قرضے لینے پر مجبور ہو جائیں، اور جب کوئی ملک ان کے سودی قرضوں کے جال میں ایک بار پھنس جائے تو جال کا پھندا روز بروز تنگ سے تنگ ہوتا چلا جاتا ہے، شرحِ سود بڑھتی جاتی، اور شرائطِ قرض سخت سے سخت ہوتی جاتی ہیں۔ اور نسل در نسل سود دَر سود اَدا کرتے کرتے مقروض ملک کی بسا اوقات یہ حالت ہو جاتی ہے کہ نہ صرف اس کے ترقیاتی منصوبے خواب بن کر رہ جاتے ہیں، بلکہ اس کی پوری قومی آمدنی اپنے دفاعی مصارف، قرضے اور سود اَدا کرنے کے لئے بھی کافی نہیں ہوتی، جس کے نتیجے میں مقامی حکمران اپنے عوام پر نت نئے ٹیکسوں کا بوجھ لاد لاد کر سود اَدا کرتے ہیں، اور نئے سودی قرضے حاصل کر کر کے گل چھرّے اُڑاتے رہتے ہیں۔ اس طرح مقامی حکمرانوں کی بھی صرف نام کی حکمرانی رہ جاتی ہے، ورنہ وہ عملاً قرض دینے والے ممالک کے لئے ٹیکس وصول کرنے والے کارندے ہی بن کر رہ جاتے ہیں۔ پھر مقامی سرمایہ داروں پر جو ٹیکس لگتے ہیں وہ اپنی پیداوار کی قیمتوں میں اتنا ہی اِضافہ کر کے، ان ٹیکسوں کا سارا بوجھ بھی صارفین کی طرف منتقل کرتے رہتے ہیں۔ مقامی کرنسی کی قیمت گرتی جاتی، اور مہنگائی بڑھتی جاتی ہے، اس طرح بیرونی ملکوں کو اَدا کئے جانے والے سود دَر سود کی تان بھی بالآخر کچلے ہوئے عوام ہی پر آ کر ٹوٹتی ہے، مقامی حکمران اور سرمایہ دار دونوں اَللِے تللّے کرتے ہیں، اور دُنیا بھر کے کمزور ملکوں سے عوام کے گاڑھے

پسینے کی کمائی نظر نہ آنے والے انداز میں کھچ کھچ کر سرمایہ دار ممالک کے خزانوں کو بھرتی چلی جاتی ہے۔[1]

سود کے خلاف قرآن کا اِعلانِ جنگ

سود کی تباہ کاریوں کی یہ بہت سادہ سی اور سامنے کی مثالیں ہیں، ورنہ سود کی معاشی، معاشرتی اور اَخلاقی ورُوحانی تباہ کاریاں اتنی زیادہ اور شاخ در شاخ ہیں، اور ہر شاخ میں اتنی تہ در تہ تفصیلات ہیں کہ ان کے لئے ایک مستقل کتاب چاہئے۔ انسانیت کے خلاف کئے جانے والے اس جرم کی اگر اُن تفصیلات سے صَرفِ نظر بھی کر لی جائے تب بھی اِن مثالوں سے یہ سمجھنا مشکل نہیں رہتا کہ قرآنِ حکیم نے سود کو حرام قرار دینے کے لئے کیوں اتنا سخت انداز اِختیار کیا کہ کفر وشرک کے علاوہ کسی بھی دُوسرے جرم کے بارے میں ایسا ہولناک انداز پورے قرآنِ کریم میں نظر نہیں آتا۔ قرآنِ کریم نے سات آیتوں میں سود کی خرابیوں اور اس کے حرام ہونے کا واشگاف اِعلان کیا ہے، جن میں سے ۴ سورۂ بقرہ میں، ایک سورۂ آلِ عمران میں (آیت: ۱۳۰) اور دو سورۂ نساء میں (آیت: ۱۶۰ و ۱۶۱) آئی ہیں، یہاں صرف سورۂ بقرہ کی آیات[2] نقل کرتا ہوں۔

۱- اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا

---

[1] یہ مضمون کئی برس پہلے لکھا گیا تھا، اُس وقت وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ کبھی ہمارے وطنِ عزیز ''اسلامیہ جمہوریہ پاکستان'' کا حشر بھی یہاں کے طالع آزما حکمران ایسا ہی کر دیں گے۔ انہوں نے تو اس سے بھی بُرا حال کر ڈالا ہے۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّاۤ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ۝

رفیع ۷؍رجب ۱۴۳۰ھ - یکم جولائی ۲۰۰۹ء

[2] آنے والے اکثر تشریحی مضامین ''تفسیر معارف القرآن'' (ج:۱ ص: ۶۴۳ تا ۶۵۶) سے ماخوذ ہیں۔

سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾

''جو لوگ سود کھاتے (یعنی لیتے) ہیں وہ (محشر میں قبروں سے) اسی طرح کھڑے ہوں گے جس طرح وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جس کو شیطان (جن) نے لپٹ کر خبطی بنادیا ہو، یہ سزا اس لئے ہوگی کہ اِن (سود خور) لوگوں نے (سود کو حلال ثابت کرنے کے لئے) کہا تھا کہ بیع (خرید و فروخت یعنی تجارت) بھی تو سود کی طرح ہے (کہ دونوں کا مقصود نفع حاصل کرنا ہے تو بیع کی طرح سود بھی حلال ہے)۔ حالانکہ (دونوں میں کھلا فرق ہے کہ) اللہ نے (جو حاکمِ مطلق ہے) بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کردیا ہے (اس سے زیادہ اور کیا فرق ہوگا؟) پھر جس کو اس کے رَبّ کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ (اس سود کے فعل اور اس کفر کے قول سے یعنی حلال کہنے سے) باز آگیا تو جو کچھ (اس حکم کے نازل ہونے سے پہلے (لینا) ہوچکا ہے وہ اُس کا رہا (یعنی لیا ہوا مال اُسی کا ہے) اور (آخرت میں) اُس کا معاملہ اللہ کے حوالے رہا (اگر دِل سے توبہ کی ہوگی تو قبول ہوگی اور منافقانہ توبہ کی ہوگی تو کالعدم ہوگی) اور جو لوگ (یہ نصیحت سن کر بھی اسی قول اور اسی فعل کی طرف لوٹیں گے تو (چونکہ اِن کا یہ فعل خود گناہِ کبیرہ ہے اس لئے) یہ لوگ جہنم میں جائیں گے، (اور چونکہ ان کا یہ قول کفر ہے اس لئے) وہ اس (جہنم) میں ہمیشہ رہیں گے۔'' (سورۂ بقرہ:۲۷۵)

یہاں یہ بات توجہ طلب ہے کہ قرآنِ حکیم نے یہ نہیں فرمایا کہ سود خور محشر میں پاگل یا مجنون ہوکر اُٹھیں گے، بلکہ دیوانہ پن کی ایک خاص صورت کا ذِکر کیا ہے کہ جیسے کسی کو

جن نے لپٹ کر خبطی بنا دیا ہو، اس میں شاید یہ اِشارہ ہے کہ بے ہوش و مجنون تو بعض اوقات چپ چاپ پڑا بھی رہتا ہے، اُن کا یہ حال نہ ہوگا بلکہ خبطیوں کی طرح بکواس اور ہذیان اور دُوسری مجنونانہ حرکتوں کی وجہ سے پہچانے جائیں گے۔ اور شاید اس طرف بھی اِشارہ ہو کہ بیماری سے بے ہوش یا مجنون ہو جانے والے کا چونکہ اِحساس بالکل معطل ہو جاتا ہے، اس کو تکلیف یا عذاب کا بھی اِحساس نہیں رہتا، مگر اُن کا یہ حال نہ ہوگا، بلکہ آسیب زدہ کی طرح تکلیف و عذاب کو پوری طرح محسوس کریں گے۔ اور سود خور کو حشر میں خبطی بنا کر اُٹھانا شاید اس کا بھی اِظہار ہے کہ وہ روپے پیسے کی ہوس میں اس قدر مدہوش ہوتا ہے کہ اس کو نہ کسی غریب پر رحم آتا ہے نہ کسی کی شرم رُکاوٹ بنتی ہے جو درحقیقت ایک قسم کا خبطی پن ہے، اس لئے محشر میں بھی اسی حالت میں اُٹھایا جائے گا۔

۲- يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾

''اللہ سود کو مٹاتا ہے (کبھی تو دُنیا ہی میں سب برباد ہو جاتا ہے، ورنہ آخرت میں تو بربادی یقینی ہے کہ وہاں اس پر عذاب ہوگا) اور صدقات کو بڑھاتا ہے (کبھی تو دُنیا میں بھی، ورنہ آخرت میں تو یقیناً بڑھتا ہے جس کی تفصیل اسی سورت کی پچھلی آیات میں آچکی ہے) اور اللہ ہر اُس شخص کو ناپسند کرتا ہے جو ناشکرا گنہگار ہو۔''

(سورۂ بقرہ:۲۷۶)

اس آیت میں سود کے ساتھ صدقات کا ذِکر اس وجہ سے لایا گیا ہے کہ سود اور صدقہ دونوں کی حقیقت میں بھی تضاد ہے، اِن کے نتائج بھی متضاد ہیں، اور عموماً اِن دونوں کاموں کے کرنے والوں کی غرض بھی متضاد ہوتی ہے، حقیقت کا تضاد تو اس لئے کہ صدقہ میں بغیر کسی معاوضے کے اپنا مال دُوسروں کو دِیا جاتا ہے، اور سود میں بغیر کسی معاوضے کے دُوسرے کا مال لیا جاتا ہے، اِن دونوں کاموں کے کرنے والوں کی غرض اور نیت اس لئے

متضاد ہے کہ صدقہ کرنے والا محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور آخرت کا ثواب حاصل کرنے کے لئے اپنا مال دُوسروں پر خرچ کرتا ہے، اور سود لینے والا اپنے موجودہ مال پر ناجائز اِضافے کا خواہش مند ہے، اور نتائج کا متضاد ہونا قرآنِ کریم کی اس آیت سے واضح ہوا کہ اللہ تعالیٰ سود سے حاصل شدہ مال کو، یا اُس کی برکت کو مٹا دیتا ہے اور صدقہ کرنے والے کے مال یا اُس کی برکت کو بڑھا دیتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مال کی ہوس کرنے والے کا مقصد پورا نہیں ہوتا، اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرنے والا جو اپنے مال کی کمی پر راضی تھا اُس کے مال میں برکت ہو کر اُس کا مال یا اُس کے ثمرات وفوائد بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

یہاں شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ آج تو سودخوروں کو بڑی سے بڑی راحت وعزّت حاصل ہے، وہ کوٹھیوں بنگلوں اور بڑے بڑے بنکوں اور ملوں کے مالک ہیں، عیش وآرام کے سارے سامان مہیا ہیں، نوکر چاکر اور شان وشوکت کے تمام ساز وسامان موجود ہیں۔

لیکن غور کیا جائے تو ہر شخص سمجھ لے گا کہ سامانِ راحت اور راحت میں بڑا فرق ہے، سامانِ راحت تو فیکٹریوں اور کارخانوں میں بنتا، اور بازاروں میں بکتا ہے، وہ روپے اور سونے چاندی کے عوض حاصل ہوسکتا ہے، لیکن جس کا نام راحت ہے وہ نہ کسی فیکٹری میں بنتی ہے، نہ کسی منڈی میں بکتی ہے، وہ ایک ایسی رحمت ہے جو براہِ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے دی جاتی ہے، وہ بعض اوقات ہزاروں سامان کے باوجود حاصل نہیں ہوسکتی، ایک نیند کی راحت کو دیکھ لیجئے کہ اسے حاصل کرنے کے لئے یہ تو کرسکتے ہیں کہ سونے کے لئے مکان کو بہتر سے بہتر بنائیں، ہوا اور روشنی کا پورا اِعتدال ہو، چارپائی اور گدّے تکیے من پسند ہوں، لیکن کیا نیند کا آجانا ان سامانوں کے مہیا ہوجانے پر لازمی ہے؟ اگر آپ کو کبھی اِتفاق نہ ہوا ہو تو ہزاروں لاکھوں وہ انسان اس کا جواب نفی میں دیں گے جن کو کسی عارضے سے نیند نہیں آتی، اور بعض اوقات خواب آور گولیاں بھی کام نہیں دیتیں۔ نیند کے سامان تو آپ بازار سے خرید لائے، مگر نیند کسی بازار سے کسی قیمت پر نہیں لاسکتے، اسی طرح دُوسری راحتوں، خوشیوں اور لذتوں کا حال ہے کہ اُن کے سامان تو روپے پیسے سے حاصل کئے

جا سکتے ہیں، مگر راحت، خوشی اور لذّت کا حاصل ہونا ضروری نہیں۔

یہ بات سمجھ لینے کے بعد سودخوروں کے حالات کا جائزہ لیجئے تو ان کے پاس آپ کو سب کچھ ملے گا مگر راحت کا نام نہ پائیں گے، وہ اپنے اَرَب کو دو اَرَب، اور دو کو تین اَرَب کرنے میں ایسے مست نظر آئیں گے کہ نہ ان کو کھانے اور آرام کا ہوش ہے، نہ اپنے بیوی بچوں کا، کئی کئی مل چل رہے ہیں، دُوسرے ملکوں سے جہاز آ رہے ہیں، اُن کی اُدھیڑ بن ہی میں صبح سے شام اور شام سے صبح ہو جاتی ہے۔ افسوس کہ انہوں نے سامانِ راحت ہی کا نام راحت سمجھ لیا ہے، اور حقیقت میں راحت سے کوسوں دُور ہیں۔

لوگ امریکا اور یورپ کے سودخوروں کی مثال سے شاید فریب میں آئیں کہ وہ لوگ تو سب کے سب خوش حال ہیں اور ان کی نسلیں بھی پھولتی پھلتی ہیں، لیکن اوّل تو ان کی خوشحالی کا اِجمالی خاکہ عرض کر چکا ہوں جس کی تازہ مثال یہ بھی ہے کہ فرانس کے ٹی وی نے خودکشی کرنے والوں کے اَعداد و شمار کے حوالے سے نشر کیا ہے کہ فرانس میں ۱۹۹۱ء کے دوران خودکشی کرنے والوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ ہر ۵ منٹ پر ایک خودکشی کا اوسط تھا۔ میرے جن دو ثقہ فرانسیسی دوستوں نے یہ بتایا، میرے سوال پر انہوں نے کہا کہ اس کی وجہ غربت و اِفلاس ہرگز نہیں کیونکہ خودکشی کرنے والوں میں بڑے بڑے مال دار بھی بہت ہیں، وجہ صرف ایک قسم کی بےچینی ہے جو ان کی زندگیوں میں گھل کر رہ گئی ہے، ایک نامعلوم سی بےچینی جس کی وجہ بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔

دُوسرے اِن کی مثال تو ایسی ہے کہ کوئی آدم خور دُوسرے انسانوں کا خون چوس چوس کر اپنا بدن پالتا ہو، اور ایسے کچھ انسانوں کا جتھ ایک محلے میں آباد ہو جائے، آپ کسی کو اس محلے میں لے جا کر مشاہدہ کرائیں کہ یہ سب کے سب بڑے فربہ اور صحت مند ہیں، لیکن ایک ہوش مند انسان کو جو اِنسانیت کی خوشحالی کا خواہش مند ہو صرف اس محلے کا دیکھنا کافی نہیں، بلکہ وہ ان بستیوں کو بھی دیکھے گا جن کا خون چوس چوس کر اُن کو اَدھ موا کر دیا گیا ہے، اس محلے اور ان بستیوں کے مجموعے پر نظر ڈالنے والا کبھی اس محلے کے فربہ ہونے پر خوش نہیں

ہوسکتا، نہ ان کے عمل کو اِنسانی ترقی کا ذریعہ بتاسکتا ہے، بلکہ اس کو اِنسان کی ہلاکت وبربادی ہی کہنے پر مجبور ہوگا۔

ان کے برعکس صدقہ خیرات کرنے والوں کو دیکھئے کہ اُن کو کبھی اس طرح مال ودولت کے پیچھے حیران وسرگرداں نہ پائیں گے، ان کو راحت کے سامان اگرچہ کم حاصل ہوں، مگر سامان والوں سے زیادہ اِطمینان اور سکونِ قلب، جو اصلی راحت ہے، ان کے پاس ہوگا، دُنیا میں ہر انسان ان کو عزّت کی نظر سے دیکھے گا۔

خلاصہ یہ کہ اس آیت میں جو یہ اِرشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے اور صدقہ کو بڑھاتا ہے، یہ مضمون آخرت کے اِعتبار سے تو بالکل صاف ہے ہی، دُنیا کے اِعتبار سے بھی اگر ذرا حقیقت سمجھنے کی کوشش کی جائے تو بالکل کھلا ہوا ہے، بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس آیت میں سودی نظامِ معیشت کی اُس بیماری کی طرف بھی اِشارہ ہو جسے آج کل کی معاشی اِصطلاح میں "Trade Cycle" (کاروباری چکر) کہا جاتا ہے کہ اس کے نتیجے میں پوری تجارت ومعیشت پر آئے دن کبھی ''اِفراطِ زر'' (Inflation) کے دورے پڑتے ہیں اور مہنگائی بڑھ جاتی ہے جس کی زد براہِ راست عوام پر پڑتی ہے، اور ملکوں کو ہلا ڈالتے ہیں، اور کبھی ''کساد بازاری'' (Depression) کا دورہ پڑجاتا ہے، جس کے نتیجے میں پورے نظامِ معیشت کی نبضیں ڈُوبنے لگتی ہیں، ارب پتی تاجر وصنعتکار بھی دیوالیہ ہوکر رہ جاتے ہیں، بڑے بڑے تجارتی مراکز ٹھپ اور کارخانے بند ہوتے چلے جاتے ہیں اور بالآخر بے روزگاری کا خوفناک عفریت پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔

۳- يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾

''اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور چھوڑ دو وہ سود جو (کسی کی طرف) باقی رہ گیا ہے، اگر تم ایمان والے ہو۔'' (سورۂ بقرہ:۲۷۸)

سود کی حرمت نازل ہونے سے پہلے عرب میں سود کا رِواج تھا، جب ممانعت آگئی تو تمام مسلمانوں نے سود کے معاملات فوراً ترک کردیئے، لیکن کچھ لوگوں کے

مطالبات سود کی بقایا رقموں کے دُوسروں پر تھے، ان کے بارے میں سوال پیش آیا کہ سود کی اس باقی رقم کا لینا دینا بھی جائز ہوگا یا نہیں؟ اس پر یہ آیت نازل ہوئی، جس کا حاصل یہ ہے کہ سود کے تمام سابقہ معاہدات ختم کر دیئے جائیں، پچھلا سود بھی وصول نہ کیا جائے صرف اصل قرضہ واپس لیا جائے۔ چنانچہ مسلمانوں کی بہت بڑی رقم جو غیر مسلموں کے ذمہ سود کی صورت میں تھی اُسے مسلمانوں نے چھوڑ دیا، سب سے پہلے جو سود چھوڑا گیا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا تھا جس کی بہت بھاری رقمیں غیر مسلموں کے ذمہ بطور سود کے عائد ہوتی تھیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ سود کافروں سے لینا بھی جائز نہیں۔

اس سے اگلی آیت میں واشگاف اِعلان ہے کہ:

۴- فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ

"پھر اگر تم ایسا نہ کرو گے تو اِعلانِ جنگ سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے۔" (سورۂ بقرہ:۲۷۹)

یہ ایسا سخت اِعلان ہے کہ کفر کے سوا کسی بڑے سے بڑے گناہ پر قرآنِ کریم میں ایسا اِعلان نہیں آیا۔

اس سلسلے کی کچھ احادیث

سود کے بارے میں یہ قرآنِ حکیم کی سات آیات میں سے صرف ۴ کا بیان ہے، اور اَحادیث تو سود کی حرمت، اس کی دِینی و دُنیاوی تباہ کاریوں، اور اس پر اللہ کے عذاب کے بارے میں چالیس ۴۰ سے بھی[1] زائد ہیں، جن میں سے یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صرف پانچ اِرشادات نقل کرتا ہوں۔

۱- عَنۡ جَابِرٍ قَالَ: لَعَنَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ

---

[1] ان سب احادیث کو میرے والدِ ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "مسئلہ سود" میں جمع فرما دیا ہے، ملاحظہ ہو اس کتاب کا ص:۶۸ تا ۹۹۔

اٰكِلَ الرِّبَا، وَمُوْكِلَهُ، وَكَاتِبَهُ، وَشَاهِدَيْهِ، وَقَالَ: هُمْ سَوَاءٌ۔

”حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے سود کھانے (لینے) والے پر، اور کھلانے (دینے) والے پر، اور اُس کے (معاہدے یا حساب) لکھنے والے پر، اور اس کے گواہ بننے والوں پر، اور فرمایا کہ ”یہ سب برابر ہیں“۔[1]

۲- عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: ”رَأَيْتُ اللَّيْلَةَ رَجُلَيْنِ أَتَيَانِي، فَأَخْرَجَانِي إِلَى أَرْضٍ مُقَدَّسَةٍ، فَانْطَلَقْنَا حَتَّى أَتَيْنَا عَلَى نَهْرٍ مِّنْ دَمٍ، فِيهِ رَجُلٌ قَائِمٌ، وَعَلَى شَطِّ النَّهْرِ رَجُلٌ بَيْنَ يَدَيْهِ حِجَارَةٌ، فَأَقْبَلَ الرَّجُلُ الَّذِي فِي النَّهْرِ، فَإِذَا أَرَادَ الرَّجُلُ أَنْ يَخْرُجَ رَمَى الرَّجُلُ بِحَجَرٍ فِي فِيهِ فَرَدَّهُ حَيْثُ كَانَ، فَجَعَلَ كُلَّمَا جَاءَ لِيَخْرُجَ رَمَى فِي فِيهِ بِحَجَرٍ فَيَرْجِعُ كَمَا كَانَ، فَقُلْتُ: مَا هٰذَا؟ فَقَالَ: الَّذِي رَأَيْتَهُ فِي النَّهْرِ اٰكِلُ الرِّبَا۔

”حضرت سمرۃ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: آج رات میں نے (خواب میں[2]) دیکھا کہ دو شخص (فرشتے) میرے پاس آئے اور مجھے ایک مقدس سرزمین کی طرف لے چلے، یہاں تک کہ ہم ایک خون کی نہر پر پہنچے، اس کے اندر ایک آدمی کھڑا تھا، اور نہر کے کنارے پر دُوسرا آدمی تھا جس کے سامنے بہت سے پتھر پڑے تھے، تو نہر کے اندر والا شخص کنارے کی طرف

---

[1] صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب لعن آکل الربا وموکلہ، حدیث:۳۹۷۲۔

[2] یاد رہے انبیائے کرام علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے۔

بڑھا، اور جب باہر نکلنے لگا تو اُس آدمی نے اُس کے منہ میں ایک پتھر اس زور سے مارا کہ اُسے جہاں تھا وہیں لوٹا دیا، پھر وہ جب بھی نہر سے نکلنے کے لئے آتا وہ اُس کے منہ میں اُسی طرح پتھر مار مار کر اُسے اپنی پہلی جگہ لوٹا دیتا تھا، میں نے (ساتھی فرشتے سے) پوچھا ''یہ کیا ہے؟'' اُس نے کہا ''جس شخص کو آپ نے نہر میں دیکھا وہ سود خور ہے۔''[1]

۳- عن عبداللہ بن حنظلة غسیلِ الملائکة قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: درهم ربا یأکُلُهُ الرَّجُلُ وَهُوَ یَعْلَمُ اَشَدُّ مِنْ سِتٍّ وَّثَلاثِیْنَ زِنْیَةً۔

''سود کا ایک درہم یہ جانتے ہوئے کھانا کہ یہ سود ہے چھتیس[۳۶] زِنا سے زیادہ سخت گناہ ہے۔''[2]

۴- عن عبداللہ عن النبی صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم قال: "الرِّبا ثلاثةٌ وسبعون بابا، ایسرُها مثلُ اَن ینکحَ الرَّجل اُمَّهٗ" هذا حدیثٌ صحیح علی شرط الشیخین وَلَمْ یُخْرِجَاهُ۔[3]

''حضرت عبداللہ یعنی ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ: سود کا گناہ تہتر[۷۳] قسم کا ہے، سب سے ادنیٰ قسم ایسی ہے جیسے کوئی اپنی ماں سے زنا کرے۔''

---

[1] صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب آکل الربا وشاهده وکاتبه، حدیث:۲۰۸۵۔

[2] مسند احمد، والطبرانی، رواهُ احمد والطبرانی فی الکبیر والأوسط، ورجال احمد رجال الصحیح کذا فی مجمع الزوائد، باب ما جاء فی الربا ج:۴ ص:۱۱۷۔ رفیع

[3] کذا فی المستدرك للحاکم، باب "ان اربی الربا عن الرجل المسلم" کتاب البیوع، ج:۲ ص:۳۷۔ وسکت علیه شمس الدین الذهبی، فی التلخیص۔ رفیع

۵- عن عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: الرِّبَا وإن كثُر فإنَّ عاقبتهٗ تَصِيْرُ إلٰى قُلٍّ۔[۱]

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: سود اگرچہ کتنا ہی زیادہ ہو، اُس کا انجام بالآخر قلّت (کمی) ہی ہے۔''

سودی بنکاری کا تتمہ ''تجارتی انشورنس''
(Commercial Insurance)

سودی بنکاری کا طریقۂ واردات آپ کے سامنے آچکا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ غریب عوام کو بہلا پھسلا کر اُن کے فراہم کردہ سرمایہ کو اُنہی کے گھروں میں نقب لگانے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، اور سارے سرمائے پر ایک خاص طبقے کی اِجارہ داری (Monopoly) قائم کر کے عملاً عوام کو انہی کی نوکری چاکری پر مجبور کر دیا جاتا ہے، پھر دولت کے اس انبار سے جب تک سرمایہ دار نفع حاصل کرتا رہے وہ اس نفع کا تنہا مالک ہوتا ہے، عوام کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہوتا، اور جب کسی ناگہانی حادثے کے باعث اُسے گھاٹا ہو جائے اور وہ دیوالیہ ہو جائے تو نقصان کا بہت تھوڑا سا حصہ اُس پر آتا ہے باقی سارا نقصان عوام کی گردنوں پر لاد دیا جاتا ہے۔

لیکن سرمایہ دارانہ ذہنیت کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ نقصان کا جو تھوڑا سا حصہ سرمایہ دار پر آرہا ہے اُس سے عوام بچے رہ جائیں، نظامِ سرمایہ داری نے اس نقصان کو بھی سرمایہ دار کے بجائے عوام سے وصول کرنے کے لئے، بلکہ اُن سے مزید سرمایہ کھینچنے کے لئے ''کمرشل انشورنس'' (تجارتی بیمہ) ایجاد کیا، اس کی بنیاد سود اور قمار (جوے) پر رکھی گئی،

---

[۱] رواہ احمد فی مسندہ، رقم الحدیث:۳۵۶۷۔

چنانچہ بنکوں کی طرح ''انشورنس کمپنیوں'' کا جال بھی آج پوری دُنیا میں پھیلا ہوا ہے۔

یہ کمپنیاں عوام کو طرح طرح کے حادثات سے ڈرا کر اور یہ لالچ دے کر کہ اگر فلاں حادثہ پیش آ گیا تو ہم تمہیں اتنی یکمشت رقم تلافیٔ نقصان کے طور پر دیں گے، اُن سے ایک مقرّرہ رقم قسط وار وصول کرتی رہتی ہیں جسے ''پریمیم'' (Premium) کہا جاتا ہے۔ سرمایہ داری نظام (Capitalism) کا یہ شعبہ بھی ''اِرتکازِ دولت'' (Concentration of Wealth) کا ایک بڑا ذریعہ ہے، کیونکہ عوام سے کھینچے گئے اس عظیم سرمائے کا بہت تھوڑا حصہ بیمہ کرانے والوں میں سے اُن افراد میں تقسیم ہوتا ہے جنہیں اِتفاقاً کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو، باقی تقریباً سارا سرمایہ کمپنی کے مالکان ہی کا خزانہ دوگنا چوگنا کرنے میں کام آتا ہے، اور معاشی نظام میں ان خرابیوں کو پیدا کرنے میں حصہ لیتا ہے جو اِرتکازِ دولت اور خودغرضی کا لازمی نتیجہ ہیں۔ تأثر یہ دیا جاتا ہے کہ بیمہ کمپنیاں بڑا اِحسان کرتی ہیں کہ ڈُوبتے کو سہارا دیتی ہیں، مگر جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آئے گی کہ یہ کمپنیاں حادثے کی تلافی کے طور پر جو رقمیں بیمہ کرانے والوں کو دیتی ہیں، بسا اوقات اُن کا بھی ایک بڑا حصہ سرمایہ دار لے اُڑتے ہیں جو بعض اوقات خود ہی اپنے کارخانے کی فرسودہ مشینوں کو آگ لگا کر بیمہ کمپنی سے ان کا معاوضہ وصول کر کے نئی مشینیں خریدنا چاہتے ہیں، یا اپنے مالِ تجارت کے ایسے ذخیروں کو آگ لگا دیتے ہیں جن کے بارے میں اندازہ ہو گیا ہو کہ ان کی قیمت گرنے والی ہے۔ بہت تھوڑے ایسے متوسط طبقے کے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کو بیمۂ زندگی کی بنیاد پر کچھ رقم مل جاتی ہے، لیکن اِن کو ملنے والی رقم کی حیثیت کمپنی کے مجموعی سرمائے کے مقابلے میں اُس چارے سے مختلف نہیں ہوتی جو مچھلی پکڑنے کے لئے شکاری اپنے کانٹے پر لگاتا ہے۔

''صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی''

خلاصہ یہ کہ کمرشل بیمہ کے ذریعے سرمایہ داروں کے نقصانات کی تلافی بھی

اُن عوام کے مال سے کی جاتی ہے جن کا نہ کبھی کوئی جہاز ڈوبتا ہے نہ اُن کے کسی گودام کو آگ لگتی ہے۔

تھرڈ پارٹی انشورنس۔ جبری

بلکہ ایک قسم کا جبری انشورنس۔ جو "تھرڈ پارٹی انشورنس" کہلاتا ہے۔ یہ تو ہر اُس شخص کو کرانا، اور اس کی فیس (Premium) ہر سال انشورنس کمپنی کو اَدا کرنا قانوناً لازم ہے جو کسی بھی چھوٹی بڑی گاڑی کا مالک ہو، حتیٰ کہ موٹر سائیکل یا موٹر رکشہ بھی، خواہ کتنی ہی بوسیدہ اور پُرانی ہو اس سے مستثنٰی نہیں۔

انشورنس کمپنی۔ جو عموماً سرکاری نہیں، بلکہ افراد کی ملکیت ہوتی ہے اور لمیٹڈ ہوتی ہے۔ یہ فیس حکومت اور قانون کی طاقت استعمال کرتے ہوئے، اتنی سختی اور پابندی سے وصول کرتی ہے کہ گاڑی کے دیگر کاغذات کی طرح اس انشورنس کا سرٹیفکیٹ بھی گاڑی میں موجود رہنا ضروری ہے، ورنہ پولیس چالان کر دیتی ہے۔

اس انشورنس کا کوئی فائدہ انشورنس کمپنی کے علاوہ کبھی گاڑی کے مالک کو بھی پہنچتا ہے یا نہیں؟ یا اس کی گاڑی سے جس بے چارے "تھرڈ پارٹی" کا نقصان ہو جائے، اُس کے نقصان کی تلافی کی بھی کوئی صورت بنتی ہے یا نہیں؟ یہ معلوم کرنے کے لئے میں نے بہت سے گاڑی مالکان سے پوچھا، (جن میں خود میں بھی داخل ہوں) سب کے جواب کا حاصل یہی تھا کہ حقیقۃً اور عملاً اس کا فائدہ ہمارے سامنے کچھ نہیں آیا سوائے اس کے کہ: "اس کی بدولت پولیس کے چالان سے بچ جاتے ہیں۔"

اب جبکہ یہ مقالہ لکھ رہا ہوں، اور انشورنس کی بات بھی آ ہی گئی، تو میں نے اپنے زیرِ استعمال گاڑی کے کاغذات جو اسی انشورنس سے متعلق ہیں، اور تقریباً پانچ صفحات پر مشتمل ہیں زندگی میں پہلی بار نکال کر اُن کا تفصیلی جائزہ لیا، یہ جائزہ جو اس مقالے کی ضرورت سے لینا پڑا، ایک قسم کی ریاضت سے کم نہ تھا، مگر یہ بات کھل کر سامنے آ گئی کہ ان

کاغذات میں جو وعدہ درج ہے کہ ایک مقرّرہ حد تک ''تھرڈ پارٹی''[۱] کے نقصان کی تلافی کی جائے گی، اس پر عمل کیوں نہیں ہوتا، اور اس انشورنس سے گاڑی والے یا ''تھرڈ پارٹی'' کو کوئی فائدہ کیوں نہیں پہنچتا؟ جو صورتِ حال سامنے آئی قارئین کی دِلچسپی کے لئے درج ذیل ہے۔

۱- اس انشورنس پالیسی سے متعلق ان کاغذات میں ساری تفصیلات انگریزی زبان میں باریک ٹائپ پر چھاپی گئی ہیں، صرف مندرجہ ذیل عبارت جو گاڑی والے کی ذمہ داری اور سزا کی سخت دھمکی پر مشتمل ہے اُردو میں، اور نسبۃً موٹے حروف میں ہے، ملاحظہ ہو:

> ''ضروری ہدایت: موٹر وہیکلز ایکٹ 1939 کی دفعہ 125/94 کے تحت بغیر انشورنس گاڑی چلانا، یا چلانے کی اجازت دینا قانوناً جرم ہے۔ بغیر انشورنس گاڑی چلانے والے کے لئے 3 ماہ تک قید جرمانہ یا دونوں سزائیں بیک وقت مقرّر ہیں۔''

گاڑی والے کی یہ ذمہ داری اور دھمکی تو کمپنی نے بڑی صاف گوئی اور ''بے تکلفی'' سے واضح حروف میں بلکہ اُردو میں بھی چھاپ دی ہے۔

۲- کمپنی کی ذمہ داری کیا ہے؟ اور وہ اس فیس کے عوض میں کیا دینے کا وعدہ کرتی ہے؟ یہ بات ''ضرورتِ شعری'' کی بناء پر صرف انگریزی زبان میں چھاپی گئی ہے، تاکہ موٹر رکشہ والے، ٹیکسی ڈرائیور، اور ٹرک ڈرائیور جیسے کم پڑھے لکھے لوگ ان کو پڑھنے کا اِرادہ بھی نہ کرسکیں، خصوصاً پاکستان جیسے ملک میں۔

۳- کمپنی کی یہ ذمہ داری اور متعلقہ تفصیلات باریک ٹائپ پر چھاپی گئی ہیں، کمزور بینائی والا انہیں ذہنی کوفت کے بغیر نہیں پڑھ سکتا۔

۴- اِن کاغذات میں تلافیٔ نقصان کے لئے زیادہ سے زیادہ جس رقم کا وعدہ کیا گیا

---

[۱] ''تھرڈ پارٹی'' سے مراد وہ شخص ہے جو گاڑی کے مالک اور ڈرائیور کے علاوہ ہو اور اسے ان کی گاڑی سے کوئی جانی یا مالی نقصان پہنچ جائے۔

ہے وہ مضحکہ خیز حد تک اتنی کم ہے کہ اُسے ٹریفک حادثے کے مقابلے میں ''برائے نام'' ہی کہا جا سکتا ہے۔ یعنی صرف بیس ہزار روپے۔ انشورنس کمپنی اس سے زیادہ ادا کرنے کی ہرگز ذمہ دار نہیں، اگرچہ نقصان لاکھوں کا، یا بے چارے ''تھرڈ پارٹی'' کی جان ہی کا ہو گیا ہو۔

۵۔ یہ وعدہ اتنی زیادہ شرائط کے ساتھ مشروط ہے کہ اُن کو پورا کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

۶۔ پھر اس وعدے سے بچنے کے لئے کمپنی کو اتنے اِختیارات دیئے گئے ہیں کہ اُن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ کمپنی اور متعلقہ قانون دراصل کسی قسم کی تلافیٔ نقصان کا اِرادہ ہی نہیں رکھتے۔

۷۔ اس قانونی تحریر میں انشورنس کمپنی کو جگہ جگہ یہ اِختیار بھی دیا گیا ہے کہ وہ اس حقیر رقم کا دعویٰ کرنے والے کے خلاف عدالت میں اپنا دِفاع کرے۔

۸۔ اس رقم کے ''بوجھ'' سے کمپنی کو بچانے کے لئے اس قانون میں اتنی صورتیں مستثنیٰ کر دی گئی ہیں کہ اُن کے ہوتے ہوئے کسی سمجھ دار آدمی کو اس حقیر رقم کی بھی اُمید نہیں رکھنی چاہئے۔

۹۔ اس رقم کی حد تک کمپنی سے تلافیٔ نقصان کا مطالبہ کرنے اور اپنا یہ حق حاصل کرنے کا طریقۂ کار کیا ہوگا؟ وہ بھی اچھا خاصا مبہم ہے۔

۱۰۔ یہ ساری تفصیلات ایسی فنی اِصطلاحوں اور قانونی زبان میں لکھی گئی ہیں کہ ان کو سمجھنے کے لئے صرف انگریزی جاننا کافی نہیں، بلکہ تلافیٔ نقصان کا مطالبہ کرنے والے کو قانونی زبان سے بھی اچھی شد بد ہونی ضروری ہے، یا پھر وہ کسی وکیل سے مدد لے، اِس کی جو فیس وکیل کو دی جائے گی اُس کا اندازہ آپ خود کر لیجئے۔

۱۱۔ جس گاڑی کے کاغذات اس وقت میرے سامنے ہیں، اس کی سالِ رواں (۲۰۰۹ء) کی ''تھرڈ پارٹی انشورنس'' کی طبع شدہ فیس -/466 روپے ہے، وہیں اس کی یہ تفصیل درج ہے کہ:

(۱) پریمیم (یعنی خالص انشورنس کی فیس جو کمپنی کے لئے ہے): -/400 روپے
(۲) انتظامی سرچارج: (پتہ نہیں یہ کس کو ملتا ہے؟) -/20
(۳) سنٹرل ایکسائز ڈیوٹی: -/40
(۴) فیڈرل انشورنس فیس: (اس کا بھی پتہ نہیں کس کو ملتی ہے؟) -/4
(۵) اسٹمپ ڈیوٹی: -/2

میزان: -/466

اب یہ فیس سالِ رواں 2013ء میں =/470 روپے وصول کی گئی ہے۔

۱۲- یہ فیس صرف ایک سال کے لئے کارآمد ہے، اگلے ہر سال کے لئے الگ فیس ادا کرنا ضروری ہے۔

۱۳- اس فیس کی ادائیگی پر کمپنی کی طرف سے جو ''انشورنس کا سرٹیفکیٹ'' پولیس کے چالان سے بچنے کے لئے گاڑی کے مالک کو ملتا ہے، وہ گاڑی کے کسی نئے مالک کو منتقل نہیں کیا جاسکتا، سال بھر میں اس گاڑی کے جتنے مالک تبدیل ہوں گے اُن سب کو اپنی اپنی فیس الگ الگ ادا کرنی ہوگی، ورنہ سب کا چالان ہوگا۔

۱۴- کمپنی سے تلافئ نقصان کی یہ حقیر رقم یعنی بیس ہزار روپے (-/20,000) حاصل کرنے کے لئے جو طریقہ تحریر کیا گیا ہے اُسے اچھی طرح سمجھنا اور اس کے مطابق کارروائی پاکستان جیسے ملک میں کرنا، عملاً کسی وکیل کے بغیر تقریباً ناممکن ہے۔

۱۵- کمپنی کا ہیڈ آفس لاہور میں، اور زونل آفس کراچی میں ہے، اب خود ہی اندازہ کرلیجئے کہ جس حادثے میں ''تھرڈ پارٹی'' کی جان یا گاڑی کو بھاری نقصان پہنچا ہے، اور وہ ان دونوں شہروں سے دُور رہتا ہے، اُس کی رسائی کمپنی کے دفتر تک کیسے ہوگی؟ اُس کے لئے تو اپنے فوری علاج یا گاڑی کی مرمت ہی سب سے بڑا مشکل مسئلہ ہے، ایسے میں آپ تصوّر کیجئے وہ مصیبت زدہ انسان کیا صرف بیس ہزار روپے کے ''گول مول'' وعدے پر اپنی قسمت آزمائی کے لئے وکیل کی فیس، لاہور یا کراچی کے سفر، وہاں کے قیام وطعام کے

مصارف اور ''انشورنس کمپنی'' جیسے طاقتور اِدارے سے نامعلوم مدّت تک مقدمہ بازی کی نئی مصیبت مول لینے کی ہمت، یا حماقت کر سکے گا؟ اور اگر بالفرض وہ کراچی یا لاہور ہی میں ہے، تب بھی کیا وہ بیس ہزار روپے سے کئی گنا زیادہ خرچ اور یہ ساری مصیبتیں جھیلنے کے بجائے اسی میں اپنی عافیت نہیں پائے گا کہ وہ کمپنی کے اُس موہوم وعدے کو بھول جائے، اور جو انشورنس فیس کمپنی نے اُس سے ہر سال وصول کی ہے، اُسے بھی ''بھتہ مافیا'' کے بھتوں کی طرح ایک جبری ''بھتہ خوری'' سمجھ کر صبر کر بیٹھے۔

بلکہ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ گاڑی کے مالکان عام طور سے یہ ''جبری بھتہ'' بھی دیگر سرکاری ٹیکسوں کی طرح کا ایک ٹیکس ہی سمجھ کر بے چون و چرا مجبوراً دیتے رہتے ہیں، بہت سوں کو یہ خبر بھی نہیں ہوتی کہ یہ رقم سرکاری خزانے کے بجائے کمپنی کے سرمایہ داروں کے پاس جارہی ہے۔

یوں تو یہ انشورنس فیس بظاہر صرف سیکڑوں میں ہوتی ہے، مگر انشورنس کمپنی کے سرمائے میں اس سے ہر سال کتنا زبردست اِضافہ ہوتا رہتا ہے، کچھ اَعداد و شمار اس کے بھی ملاحظہ ہوں:

کراچی میں گاڑیوں کی تعداد

کراچی ٹریفک پولیس کے ڈی آئی جی کی رپورٹ جو ۱۶/اپریل ۲۰۰۸ء کو جاری ہوئی اُس کے مطابق کراچی میں کل رجسٹرڈ گاڑیوں کی تعداد ۲۰۰۷ء میں 18,09,500 (اٹھارہ لاکھ نو ہزار پانچ سو) تھی۔

اس رپورٹ میں یہ تفصیل بھی دی گئی ہے کہ کراچی شہر میں ۲۰۰۲ء سے ۲۰۰۷ء تک ہر سال گاڑیوں میں کتنا اضافہ ہوتا رہا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر سال اضافے کی شرح بھی بڑھتی چلی گئی ہے، چنانچہ ۲۰۰۶ء میں 1,78,763 (ایک لاکھ اٹھتر ہزار سات سو تریسٹھ) گاڑیوں کا اِضافہ ہوا تھا، اور ۲۰۰۷ء میں 1,98,743

(ایک لاکھ اٹھانوے ہزار سات سوسینتالیس) گاڑیوں کا اِضافہ ہوا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اس رپورٹ میں ۲۰۰۷ء کے بعد ۲۰۰۸ء کا اضافہ اور کل تعداد درج نہیں، مگر یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ ۲۰۰۸ء میں گاڑیوں کا کم از کم اضافہ اتنا ضرور ہوا ہوگا جتنا ۲۰۰۷ء میں ہوا تھا، یعنی ایک لاکھ اٹھانوے ہزار سات سو تینتالیس (1,98,743)، لہٰذا ۲۰۰۸ء میں کراچی مین گاڑیوں کی تعداد کم از کم بیس لاکھ آٹھ ہزار دو سو تینتالیس (20,08,243) بنتی ہے۔

اب نئی رپورٹ جس میں 31 دسمبر 2011ء تک کے اعداد وشمار ہیں اس کے مطابق کراچی شہر میں کل رجسٹرڈ گاڑیوں کی تعداد 26,14,580 (چھبیس لاکھ چودہ ہزار پانچ سو اسّی) ہے۔[1] اس سے پتہ چلتا ہے کہ ۲۰۰۸ء سے ۲۰۱۱ء تک صرف شہر کراچی میں چھ لاکھ چھ ہزار تین سو سینتیس (6,06,337) گاڑیوں کا اضافہ ہوا ہے۔

پیچھے تفصیل آچکی ہے کہ انشورنس فیس -/466 روپے میں سے کمپنی کو -/400 روپے ایک گاڑی پر ملتے ہیں، ہوسکتا ہے کہ چھوٹی گاڑیوں مثلاً موٹر سائیکلوں کی فیس اس سے کم، اور بڑی گاڑیوں مثلاً بس اور ٹرک وغیرہ کی فیس اس سے زیادہ ہوتی ہو، نیز معلوم ہوا کہ کمپنی ''سخاوت'' کرتے ہوئے بعض لوگوں اور اِداروں کی فیس میں کچھ کمی بھی کردیتی ہے، اس لئے ہم کمپنی کے ساتھ رعایت کرتے ہوئے اس کی فیس -/400 سے گھٹا کر -/300 روپے فرض کرلیتے ہیں، اور 2011ء میں کراچی کی گاڑیوں کی تعداد 26,14,580 کو 300 سے ضرب دیتے ہیں تو ٹوٹل: 78,43,74,000 (اٹھتر کروڑ، تینتالیس لاکھ، چوہتر ہزار روپے) بنتا ہے۔ جبکہ ۲۰۰۸ء میں گاڑیوں کی تعداد 20,80,243 کے حساب سے کل رقم 60,24,72,900 (ساٹھ کروڑ، چوبیس لاکھ، بہتر ہزار، نوسو روپے) تھی، یعنی ان تین سالوں میں مزید 18,19,01,100 (اٹھارہ کروڑ، انیس لاکھ، ایک ہزار، ایک سو) روپے کا اضافہ ہوا ہے۔

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: Urban Resource Centre کی ویب سائٹ۔

یہ اٹھتر کروڑ روپے سے زیادہ رقم (یا اس سے کم وبیش) جو عوام سے کمپنی کو قانون کے زور پر دلوائی گئی، یہ زبردستی کی ''بھتہ خوری'' نہیں تو کیا ہے؟

یہ تو صرف کراچی کے اعداد وشمار ہیں، پورے پاکستان میں ۲۰۰۷ء میں گاڑیوں کی تعداد کیا تھی؟ تو روزنامہ ''جنگ'' کے ''ڈیویلپمنٹ رپورٹنگ سیل'' کی رپورٹ مؤرخہ ۲۵/اگست ۲۰۰۸ء میں یہ تعداد باسٹھ لاکھ دس ہزار (62,10,000) بتائی گئی ہے۔[1] اس رپورٹ میں یہ واضح نہیں کہ اس تعداد میں چھوٹی سے چھوٹی گاڑیاں مثلاً موٹر سائیکلیں اور بڑی سے بڑی گاڑیاں مثلاً ٹرک، بسیں، اور ٹرالر بھی شامل ہیں یا نہیں؟ جبکہ کراچی شہر سے متعلق رپورٹ میں اِن سب قسم کی گاڑیوں کو شمار کیا گیا ہے۔ پھر بھی ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ پاکستان بھر کی گاڑیوں کی مذکورہ بالا تعداد (62,10,000) میں یہ سب قسم کی گاڑیاں شمار کر لی گئی ہیں۔ اس تعداد کو تین سو (300) سے ضرب دے کر جواب: (1,86,30,00,000) آتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اعداد وشمار دُرست ہیں تو صرف ایک سال ۲۰۰۷ء میں اس انشورنس کی فیس کمپنی (یا کمپنیوں) کو ایک اَرب، چھیاسی کروڑ، تیس لاکھ روپے دِلوائی گئی ہے۔ پیچھے آچکا ہے کہ ہر سال گاڑیوں کی تعداد میں لاکھوں کے حساب سے اِضافہ ہو رہا ہے، ۲۰۰۶ء کے مقابلے میں ۲۰۰۷ء میں صرف کراچی میں 1,98,743 گاڑیوں کا اِضافہ ہوا تھا، پورے پاکستان میں کتنا اِضافہ ہوا ہوگا؟

سوال رواں 2013ء میں ورلڈ بنک کی رپورٹ کے مطابق پورے ملک میں گاڑیوں کی تعداد ستر لاکھ (70,00,000) بتائی گئی ہے۔[2] (یعنی ۲۰۰۸ء کی کل گاڑیوں کی تعداد سے سات لاکھ، نوے ہزار (7,90,000) زیادہ گاڑیاں) پاکستان بھر کی گاڑیوں کی مذکورہ بالا تعداد (70,00,000) کو تین سو (300) سے ضرب دے کر جواب

---

[1] ملاحظہ ہو روزنامہ ''جنگ'' کی ویب سائٹ:
http://search.jang.com.pk.details.asp?nid=312130

[2] ملاحظہ ہو روزنامہ ''ورلڈ بینک'' کے ویب سائٹ:
www.worldbank.org/Pakistan-HighwayData

(2,10,00,00,000) آتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ اعداد وشمار درست ہیں تو صرف ایک سال میں اس انشورنس کی فیس کمپنی (یا کمپنیوں) کو دو ارب، دس کروڑ، روپے دلوائی گئی ہے۔ پیچھے آچکا ہے کہ ہر سال گاڑیوں کی تعداد میں لاکھوں کے حساب سے اضافہ ہورہا ہے، اس لحاظ سے ہر سال کمپنی (یا کمپنیوں) کی انشورنس کی فیس میں بھی کروڑوں روپے کا اضافہ ہورہا ہے۔

عوام سے جن میں بھاری اکثریت غریبوں اور متوسط طبقے کی ہے، انشورنس کمپنیوں کے لئے سالانہ اربوں روپے کی ایسی لوٹ مار کو قانونی جواز فراہم کرنا، اسے بیوروکریسی اور سرمایہ داروں کی ملی بھگت کے سوا کیا نام دیا جائے؟

یہ ایک چھوٹا سا ''چور دروازہ'' ہے، جس سے آپ دیکھ رہے ہیں، عوام کی دولت کیسی معصومیت اور خوبصورتی کے ساتھ سرمایہ داروں کی جھولی میں ڈال دی جاتی ہے، نظامِ سرمایہ داری کا، اس نظر سے تفصیلی جائزہ لیا جائے تو نہ جانے ایسے کتنے چھوٹے بڑے خوبصورت ''چور دروازے'' دیکھنے کو مل جائیں گے، اور ان کو اِیجاد کرنے والی ''یہودی ذہن کی چالاکی'' کی داد دینی پڑے گی۔

غرض نظامِ سرمایہ داری ایک ایسی خوبصورت چکی ہے جس کا ایک پاٹ بیوروکریسی (حکمران) اور دُوسرا پاٹ وہ سرمایہ دار ہوتے ہیں جو حلال وحرام کی پابندیوں سے آزاد ہوں، ان دو پاٹوں کے درمیان عوام کو انتہائی بے رحمی کے ساتھ ''جمہوریت'' کے نام پر اس چالاکی سے پیسا جاتا ہے کہ پسنے والوں کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ پیسنے والا کون ہے؟

خنجر پہ کوئی داغ نہ دامن پہ کوئی چھینٹ
تم قتل کرو ہو کہ کرامات کرو ہو!

اس نظام کے تحت ہر سودی بنک ''خونی بنک'' (Blood Bank) ہوتا ہے، جس میں غریبوں کا خون اسٹور کرکے عالمی ساہوکاروں کو منتقل کیا جاتا ہے۔

مروّجہ بیمے کی جو مختلف قسمیں اب تک ہمارے علم میں آئی ہیں، وہ یا تو سود پر مبنی

ہوتی ہیں، یا قمار (جوے) پر، یا دونوں پر، سود کی شدید حرمت پر قرآن وحدیث کے واضح اعلانات پیچھے آچکے ہیں۔

قمار (جُوے) کی حرمت پر قرآن کا اِعلان

قمار (جوے) کے بارے میں قرآنِ حکیم کا دوٹوک فرمان جو قمار کے ساتھ شرک اور شراب کی خباثتوں کو بھی بیان کر رہا ہے یہ ہے کہ:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾

"اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب، اور جوا، اور بت، اور جوے کے تیر (جن سے ایک خاص قسم کا جوا کھیلا جاتا تھا) یہ سب گندے شیطانی کام ہیں، لہٰذا اِن سے بچو، تاکہ تم کو دُنیا وآخرت کی کامیابی ملے۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوے کے ذریعے تمہارے درمیان دُشمنی اور بغض ڈال دے اور اللہ تعالیٰ کی یاد اور نماز سے تم کو روک دے، تو (بتلاؤ) تم اب بھی (اِن ناپاک شیطانی کاموں سے) باز آؤ گے؟" (سورۂ مائدہ آیت: ۹۰و۹۱)

قمار کے بارے میں حدیث شریف

قمار اور جوے کی خرابی کا کچھ اندازہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی ہوگا کہ:

مَنْ قَالَ لِصَاحِبِهٖ "تَعَالَ اُقَامِرْكَ" فَلْیَتَصَدَّقْ۔

''جس شخص نے کسی سے محض زبان سے یہ کہہ دیا کہ '' آؤ جوا کھیلیں''
(اگرچہ عمل نہ کیا ہو) تو وہ (بھی ایک گناہ کا مرتکب ہوگیا) اُس کو
چاہئے کہ (اس گناہ کی تلافی کے لئے) صدقہ کرے۔''[1]

سودی بنکاری وانشورنس کا اِسلامی متبادل

یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوگا کہ موجودہ دور میں جبکہ بنکوں کے بہت سے کام انسانی ضرورت بن چکے ہیں، ہر شخص اپنی بچت کی رقمیں بنکوں میں رکھوانے پر تقریباً مجبور ہے، نیز بین الاقوامی تجارت میں رقوم کو ایک شہر سے دُوسرے شہر اور ایک ملک سے دُوسرے ملک بھیجنے کے لئے بنکوں کے سوا کوئی محفوظ راستہ نہیں، پھر لوگوں کی بچت کی رقمیں گھروں میں منجمد کر کے رکھ دینے کے بجائے انہیں جمع کر کے ملک کی صنعت وتجارت میں لگانا خود ایک مفید کام ہے جس سے بچت کرنے والوں کو بھی فائدہ پہنچایا جاسکتا ہے، اور ملک میں صنعتی وتجارتی سرگرمیوں کو فروغ دے کر عوام کے لئے روزگار کے مواقع بڑے پیمانے پر پیدا کئے جاسکتے ہیں، اس طرح بچتوں کی یہ رقمیں ملک کی معاشی ترقی میں بہت مددگار ہوسکتی ہیں، تو کیا اسلامی تعلیمات میں ایسے متبادل طریقے موجود ہیں جن کے ذریعے مذکورہ بالا ضرورتیں سود وقمار سے بچتے ہوئے پوری کی جاسکیں؟ اور بنکاری وانشورنس کو سود وقمار کے بغیر چلایا جاسکے؟

غیر سودی بنکاری

جواب یہ ہے کہ الحمدللہ ایسے طریقے موجود ہیں، اس سلسلے میں علمی طور پر خاصی پیش رفت تو پہلے ہی ہوچکی تھی، شرقِ اَوسط میں دوتین غیر سودی بنک قائم بھی ہوئے تھے، لیکن ٹھوس علمی کام بڑے پیمانے پر سب سے پہلے پاکستان کی ''اسلامی نظریاتی کونسل'' نے

---

[1] صحیح مسلم، عن ابی هریرة رضی الله عنه، کتاب الایمان، باب من حلف باللّات والعُزّٰی، حدیث: ۴۲۷۰۔

۱۹۸۰ء کی دہائی میں اپنے قائم کردہ ایک پینل کے ذریعے شروع کیا، اور سود سے پاک بنکاری کے ۱۲ طریقے تجویز کئے، اس کام میں ماہرینِ شریعت علمائے کرام کے ساتھ معاشیات، بنکاری، تجارت اور قانون کے تجربہ کار ماہرین شب وروز شریک رہے۔ اسلامی نظریاتی کونسل کی یہ رپورٹ پورے عالمِ اسلام کے لئے مشعلِ راہ بنی، اور دُوسرے اسلامی ممالک نے اس کی بنیاد پر اسلامی معاشیات اور غیر سودی بنکاری کے کام کو آگے بڑھایا۔

بحمداللہ اس وقت دُنیا بھر کے تقریباً دوسو مالیاتی اِدارے غیر سودی بنکاری کا نظام جزوی طور پر چلا رہے ہیں، جزوی کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے یہاں ایک ایک شعبہ ایسا بھی قائم کر دیا ہے جس میں بنکاری سود کے بغیر ہو سکے۔

پاکستان کی سپریم کورٹ کی ''شریعت اپیلیٹ بنچ'' نے - جس کے رُوحِ رواں برادرِ عزیز مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تھے - اپنے ایک تاریخ ساز فیصلے میں - جو گیارہ سو صفحات پر مشتمل ہے - سودی لین دین کی ہر شکل کو قرآن وسنت کے خلاف ہونے کے باعث جون ۲۰۰۱ء سے قانوناً ممنوع قرار دے دیا، مگر افسوس کہ پاکستان کی فوجی آمرانہ حکومت نے طرح طرح کے رُسوا کن ہتھکنڈے اِستعمال کر کے نہ صرف اس فیصلے پر عملدرآمد کو رُکوادیا، بلکہ فیصلہ کرنے والے جج صاحبان ہی کو رُخصت کر کے اپنی اس سیاہ کاری کا متعفن داغ بھی سینے پر سجالیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

لیکن غیر سودی بنکاری وقت کی آواز ہے، اس آواز پر ''لَبَّیْك'' کہتے ہوئے، الحمدللہ اب ایسے بنک بھی پاکستان سمیت کئی ملکوں میں قائم ہونے لگے ہیں جنہوں نے اپنے تمام شعبوں اور کاروبار کو سود وقمار کے بغیر اَنجام دینے کا تہیہ کر لیا ہے۔

شرکت ومضاربت

غیر سودی بنکاری کے لئے جو طریقے شروع کئے گئے ہیں ان میں مثالی طریقہ ''شرکت ومضاربت'' کا ہے، اسی سے اسلامی معیشت کے وہ اعلیٰ مقاصد حاصل ہو سکتے

ہیں جن سے ملک میں تقسیمِ دولت (Distribution of Wealth) کے نظام پر اچھے اثرات مرتب ہوں گے سودی بنکوں اوران کے گاہک سرمایہ داروں کے پیدا کردہ "اِرتکازِ دولت" (Concentration of Wealth) اور اِجارہ داریوں (Monopoly) کے برخلاف، سرمایہ کا نفع سکڑنے کے بجائے پھیلے گا، یعنی بنکوں کے کھاتہ داروں (Depositors) تک معقول انداز میں پہنچے گا، کیونکہ غیر سودی بنک اپنے گاہک سرمایہ داروں سے سود لینے کے بجائے ان کی تجارت اور نفع ونقصان میں شریک ہوں گے، اور بنکوں کے کھاتہ دار اپنے اپنے بنکوں کے نفع ونقصان میں شریک ہوں گے، اس طرح بنکوں کے کھاتہ دار بھی تقریباً پوری ملکی تجارت میں شریک ہوجائیں گے، اور اُن کو اپنی بچتوں پر سود کی حقیر رقم کے بجائے ملکی تجارت کے منافع میں سے اِن شاءاللہ بہت معقول حصہ ملے گا۔

دُوسرے متبادل طریقے

بنکنگ کے دُوسرے متبادل طریقے مثلاً "مرابحہ" اور "اِجارہ" (Leasing) وغیرہ بھی اگرچہ سود سے پاک اور شرعاً جائز ہیں، لیکن اگر "شرکت ومضاربت" کے بجائے ان ہی پر اِنحصار کرلیا گیا، یا ان کو ضرورت سے زیادہ اِستعمال کیا گیا تو شرعی جواز کے باوجود اِن سے بہت سی اُن معاشی خرابیوں کا علاج نہ ہوسکے گا جو نظامِ سرمایہ داری کی پیداوار ہیں، اور جن سے جان چھڑائے بغیر عمومی خوش حالی کا خواب پورا نہیں ہوسکتا۔ اُن معاشی خرابیوں کا کچھ بیان پیچھے "سودی بنکاری" کے عنوان میں آچکا ہے۔

غیر سودی بنکاری کو صحیح معنیٰ میں چلانے کے لئے بنکوں کو، اور اُن سے کاروبار کرنے والی صنعتی وتجارتی برادری کو، نظامِ سرمایہ داری (Capitalism) کی خودغرضانہ سوچ سے ہٹ کر اِسلامی سوچ اور اِنصاف کا مظاہرہ کرنا پڑے گا۔

اور سب سے بڑھ کر ہماری اسلامی جمہوریہ پاکستان کی حکومت کو معاشی میدان میں اپنا آئینی اور منصبی فریضہ ادا کرتے ہوئے اِنقلابی نوعیت کے اِقدامات کرنے ہوں

گے جن میں سرِفہرست یہ ہے کہ وہ سود اور قمار کی تمام شکلوں کو قانوناً ممنوع قرار دے۔
ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان تینوں فریقوں یعنی حکومت، غیر سودی بنکوں اور ان سے کاروبار کرنے والی صنعتی وتجارتی برادری کو اس کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

موجودہ انشورنس کا اسلامی متبادل

جہاں تک انشورنس کے اسلامی متبادل کا تعلق ہے، بحمد اللہ اس میں بھی اہم پیش رفت ہو رہی ہے، اِمدادِ باہمی کے اُصول پر اس مقصد کے لئے ''وقف اِدارے'' قائم ہو رہے ہیں۔ ان اِداروں کے ذریعے اِن شاء اللہ ان اِداروں کے ممبروں کو اپنے حوادث اور نقصانات کی مکمل تلافی کا اِسلامی راستہ میسر آجائے گا۔ اور چونکہ یہ اِدارے موجودہ انشورنس کمپنیوں کی طرح کسی شخص یا اشخاص کی ملکیت میں نہیں ہوں گے، بلکہ وقف ہوں گے، اس لئے اِن وقف اِداروں میں جو رقمیں ان کے ممبران نے جمع کرائی ہوں گی ان میں یہ نہیں ہوگا کہ جتنی رقم خساروں کی تلافی کے لئے ممبران کو دی گئی اُس سے بچی ہوئی ساری رقمیں اِن اِداروں کے منتظمین اپنی مَلکیت میں لے کر اپنی تجوریاں بھرنے لگیں، بلکہ وہ بچی ہوئی رقمیں اُن اِداروں میں وقف کے طور پر بطورِ امانت رہیں گی، جو مقرّرہ قواعد اور طے شدہ شرائطِ وقف کے مطابق یا تو ہر سال ممبران ہی میں تقسیم کر دی جایا کریں گی، یا ان کو خیراتی کاموں میں لگایا جا سکے گا، جس کا فائدہ معاشرے کے کمزور طبقات اور عوام کو پہنچے گا۔ اس طرح یہ وقف اِدارے بھی اِرتکازِ دولت اور خود غرضی کے بجائے اِن شاء اللہ معاشرے کی فلاح و بہبود میں حصہ لیں گے۔

نظامِ سرمایہ داری میں بازار آزاد نہیں ہوتے

سرمایہ داری نظام کو ''آزاد معیشت'' اور ''آزاد تجارت'' کا نام دِیا جاتا ہے، حالانکہ غور کیا جائے تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اس نظام میں نہ طلب ورسد

(Demand and Supply) آزاد ہوتی ہے نہ معیشت وتجارت نہ بازار، بلکہ صرف سرمایہ دار آزاد ہوتے ہیں، جو معیشت وتجارت اور بازار کی آزادی کا گلا گھونٹ کر قوموں اور ملکوں پر پوری خودغرضی سے حکمرانی کرتے ہیں۔ ہاں سوشلزم کے مقابلے میں اس نظام کو آزاد نظام اس حوالے سے ضرور کہا جاتا ہے کہ اس میں سوشلزم کے برخلاف سرمایہ دار آزاد ہوتے ہیں، لیکن تجارت ومعیشت اور عوام کی آزادی اس نظام میں بھی ناپید ہے۔

پاکستانی معیشت نظامِ سرمایہ داری اور نظامِ جاگیرداری کا ملغوبہ ہے، دیہات میں عوام جو ملکی آبادی کا تقریباً اَسّی فیصد ہیں، جاگیرداروں، وڈیروں، سرداروں، چوہدریوں اور خوانین کے بے دام غلام ہیں تو شہروں میں سرکاری افسروں اور سرمایہ داروں کے رحم وکرم پر۔

اس کے برخلاف اسلام نے معیشت اور تقسیمِ دولت کے جو اُصول مقرّر کئے ہیں ان کا ایک اہم مقصد یہ ہے کہ دولت چند ہاتھوں یا خاص خاص طبقوں میں سمٹنے کے بجائے (جسے اِرتکازِ دولت کہا جاتا ہے) معاشرے میں زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر گردش کرے، اس طرح امیر وغریب کا تفاوت، جس حد تک فطری اور قابلِ عمل ہو، کم سے کم کیا جائے، رَسَد وطلب کی فطری قوتیں اور بازار آزاد ہوں، وسائلِ معاش کی بہتات ہو، اور ہر شخص کو اپنی صلاحیت، محنت اور سرمایہ کے تناسب سے کسبِ معاش اور روزگار کے مواقع حاصل ہوں۔

اِرتکازِ دولت (Concentration of Wealth) کی بیخ کنی

چنانچہ اسلام کی معاشی تعلیمات نے ہر اس راستے پر پہرے بٹھائے ہیں جس سے ''اِرتکازِ دولت'' کو راہ ملتی ہو۔ قرآنِ حکیم کا اِرشاد ہے:

كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۭ

''تاکہ وہ (مال) تم میں سے (صرف) مال داروں کے درمیان ہی

گردش نہ کرنے لگے۔" (سورۂ حشر:۷)

چنانچہ اسلام نے جائز طریقوں سے حاصل کی ہوئی دولت کی اِنفرادی ملکیت کا (سوشلزم کے برخلاف) جہاں اتنا اِحترام کیا ہے کہ اس کے تحفظ کے سخت قوانین مقرّر کئے اور اس کی طرف ناجائز طور پر بڑھنے والا (چور کا) ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا، وہیں اِنفرادی ملکیت کو نظامِ سرمایہ داری کی طرح بے لگام بھی نہیں چھوڑا، اس پر بھی کچھ پابندیاں ایسی عائد کردی ہیں کہ دولت اور وسائلِ معاش پر کسی خاص طبقے کی اِجارہ داری (Monopoly) قائم نہ ہوسکے، اور عوام ان کے محتاج ہوکر محرومی کا شکار نہ ہوجائیں۔ چنانچہ اسلام کے مندرجہ ذیل اَحکام "اِرتکازِ دولت" کی راہ میں بہت بڑی رُکاوٹ ہیں۔

(۱) سود اور جوا (قمار) کو، جن کے ذریعے دولت سمٹ سمٹ کر چند اَفراد اور خاندانوں میں دائر ہوکر رہ جاتی ہے، سخت حرام قرار دے دیا گیا، ان کی سخت حرمت کا بیان پیچھے آیاتِ قرآنیہ اور اَحادیثِ نبویہ کی صورت میں آچکا ہے۔

(۲) سٹے کو بھی حرام قرار دینے کی ایک حکمت یہی ہے جیسا کہ آگے رسد وطلب کے بیان میں آئے گا۔

(۳) آڑھت اور ذخیرہ اندوزی کی بھی وہ صورتیں ممنوع کردی گئیں جو مہنگائی کا سبب بنتی، اور اِرتکازِ دولت میں معاون ہوتی ہیں، ان سے متعلق کچھ احادیث "رَسد وطلب" کے بیان میں آئیں گی۔

(۴) جو دولت کسی کے پاس جائز طریقوں سے جمع ہوئی، اس میں بھی غریبوں کے حقوق مقرّر کردیئے گئے، چنانچہ قرآنِ حکیم نے مؤمنین کی ایک صفت یہ بیان کی ہے کہ:

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ﴿۲۴﴾ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ﴿۲۵﴾

"اور جن کے اموال میں حق مقرّر ہے، مانگنے والے کا اور محروم کا۔"

(سورۃ المعارج:۲۴،۲۵)

چنانچہ مال داروں پر زکوٰۃ، عشر، صدقۃ الفطر، قربانی کی کھال اگر فروخت کردی

جائے تو اس کی قیمت کا صدقہ، نمازوں اور روزوں کا فدیہ اور بہت سی صورتوں میں مالی کفارے بھی مقرّر مقدار میں فرض کر دیئے گئے جنہیں صرف غریبوں کا حق قرار دیا ہے۔ اس آیت میں ''حق'' کا لفظ خود بتلا رہا ہے کہ یہ دینا غریبوں پر صرف اِحسان نہیں بلکہ اُن کا حق اور مال داروں کا فرض ہے۔

(۵) مسلم ممالک میں رہنے والے غیر مسلموں پر صرف ایک ٹیکس ''جزیہ'' لگایا گیا ہے، اور اگر ان کے پاس پیداواری زمین بھی ہے تو اُس پر بھی معمولی مقدار میں ٹیکس لگایا گیا ہے، جسے ''خراج'' کہا جاتا ہے۔

(۶) دُشمن سے حاصل شدہ مالِ غنیمت اور ''مالِ فے'' کی تقسیم کا منصفانہ نظام قائم کیا گیا۔

(۷) ''نفقات'' کا ایک مستقل باب مقرّر فرما کر خواتین، بچوں، یتیموں اور معذور ومحتاج رشتہ داروں کی کفالت کی قانونی ذمہ داری ایک خاص درجہ بندی کے ساتھ، اَفرادِ خاندان پر ڈالی گئی ہے، حتیٰ کہ اگر خاندان کے صاحبِ اِستطاعت افراد اس ذمہ داری کو اَدا نہ کریں تو ان کے خلاف عدالتی چارہ جوئی بھی کی جا سکتی ہے، (تفصیل کے لئے فقہ کی کتابوں میں ''باب النفقات'' کا مطالعہ کیا جائے)۔

(۸) اللہ کے راستے میں رضا کارانہ طور پر نفلی صدقات، صدقہ جاریہ اور اوقاف وغیرہ کے ذریعے مال خرچ کر کے معاشرے کے کمزور طبقات کو سہارا دینے کا نہایت پُرکشش ترغیبی انداز اِختیار کیا گیا ہے، اور اس پر دُنیا میں خیر و برکت کا، اور آخرت میں عظیم الشان دائمی ثواب کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔

(۹) پھر زندگی بھر کے تمام اِخراجات کے بعد جو کچھ اِنسان کے پاس مرنے کے وقت تک باقی رہ گیا، اِسے ایک خاص حکیمانہ فطری اُصول کے مطابق میراث کی صورت میں اس کے اہلِ خانہ اور رشتہ داروں میں تقسیم کرنے کا قانون مقرّر فرما دیا گیا، جبکہ مسیحی مذہب میں مرنے والے کی ساری میراث اُس کے سب سے بڑے بیٹے یا سب سے

بڑی بیٹی کو دے دی جاتی ہے، باقی سارے رشتہ دار حتیٰ کہ بیوی اور باقی بچے اور ماں باپ بھی محروم رہتے ہیں۔ جبکہ اسلام کے قانونِ میراث کے ذریعے ہر شخص کی دولت اور جائیداد بہت سے لوگوں میں بتدریج نسلاً بعد نسلٍ منتقل اور تقسیم ہوتی رہتی ہے، اور اِرتکازِ دولت کا خاتمہ ہوتا رہتا ہے۔

(۱۰) طلب ورسد کی فطری قوتوں کا تحفظ کیا گیا ہے، جن کا عدمِ تحفظ اِرتکازِ دولت کا بہت بڑا سبب بھی ہے اور نتیجہ بھی، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

اس کے باوجود بھی اگر کبھی کچھ مال دار لوگ اپنی اِجارہ داریاں قائم کر کے دُوسروں پر رِزق کے دروازے تنگ کرنے لگیں تو ایسی اِجارہ داریوں کو توڑنے کے لئے اسلامی حکومت کو مداخلت کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے، جس کی تفصیلات اسلامی فقہ میں دیکھی جاسکتی ہیں۔

اِس طرح اِرتکازِ دولت کے تمام چور دروازے بند کر کے صنعت وتجارت اور ملازمت ومزدوری کے ایسے منصفانہ اُصول مقرر کر دیئے گئے کہ اگر کسی ملک میں صحیح معنوں میں اسلامی نظام اپنی رُوح کے ساتھ نافذ ہو، معیشت، سود وقمار اور سٹہ جیسی نجاستوں سے پاک ہو، اور بنکنگ اسلامی تعلیمات کے مطابق بڑی حد تک شرکت ومضاربت کے اُصول پر، اور انشورنس اِمدادِ باہمی کے اُصولوں پر قائم ہو تو وہاں لازمی طور پر دولت کی تقسیم میں توازن ہوگا، پورے ملک کے تجارتی سرمایہ کا نفع ونقصان عوام تک پہنچے گا، کھاتہ داروں کے مفادات اور دِلچسپیاں پوری ملکی تجارت سے وابستہ ہوں گی، ملکی تجارت کے نقصان سے سب کا نقصان ہوگا جس سے بچنے کے لئے سب مل کر کوشش کریں گے، اور اس کا فائدہ سب کا فائدہ ہوگا، جسے بڑھانے میں وہ اپنی توانائیاں صَرف کریں گے۔

اور آج کل طرح طرح کے مشتعل ہجوم جس بے دردی سے بنکوں، گاڑیوں، تجارتی عمارتوں اور بجلی کے کھمبوں کو توڑتے اور جلاتے ہیں اس کا بڑی حد تک خاتمہ ہو جائے گا، کیونکہ سب جانتے ہوں گے کہ ان املاک میں ان کا بھی حصہ ہے، ان املاک کے نفع

ونقصان میں خود وہ بھی شریک ہیں۔ بازار آزاد ہوں گے، طلب ورسد کی فطری قوتیں کسی طبقے کی گرفت میں نہیں ہوں گی، بازار میں مسابقت (کمپٹیشن) کے نتیجے میں مہنگائی بڑھنے کے بجائے اشیائے ضرورت کی قیمتوں، تاجروں کے منافع اور کارکنوں کی اُجرتوں میں توازن ہوگا، چھوٹے تاجر، دستکار اور چھوٹی صنعتیں بڑے بڑے سرمایہ داروں کے رحم وکرم پر نہ ہوں گی، ملکی دولت پورے معاشرے میں گردش کرے گی جس کے نتیجے میں روزگار کے مواقع سمٹنے کے بجائے پورے ملک اور پورے معاشرے میں پھیلتے چلے جائیں گے، ملازم ومزدور اس پر مجبور نہیں ہوں گے کہ یا تو زمیندار اور کارخانے دار کی من مانی شرائط پر کام کریں، یا بھوکے ننگے رہ جائیں، چنانچہ ایک مزدور جسے ایک زمیندار یا کارخانہ دار مناسب اُجرت دینے پر تیار نہیں، یا اس کو وہاں عزّتِ نفس نہیں ملتی وہ اطمینان سے اسے چھوڑ کر دُوسرا ذریعہ معاش اختیار کرسکے گا، جس کی کچھ تفصیل آگے معلوم ہوگی۔

''طلب ورسد'' (Demand And Supply) کی آزادی کا تحفظ

دُنیا کے قدرتی نظام پر غور کرنے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ یہاں ہر شخص، ہر شعبۂ زندگی میں اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے دُوسرے کی امداد کا محتاج ہے، اور سب اِنسان اسی باہمی اِحتیاج کے رشتے میں بندھے ہوئے، ایک دُوسرے کی، اور پورے معاشرے کی ضرورت کی تکمیل کر رہے ہیں، مرد عورت کا محتاج ہے، عورت مرد کی، ماں باپ اولاد کے محتاج ہیں، اولاد ماں باپ کی، اُستاذ شاگرد کا محتاج ہے، شاگرد اُستاذ کا، تاجر گاہک کا محتاج ہے، گاہک تاجر کا، صنعتکار مزدور کا محتاج ہے، مزدور صنعتکار کا، زمیندار کاشتکار (ہاری) کا محتاج ہے اور کاشتکار زمیندار کا۔

باہمی اِحتیاج کے اس قدرتی نظام کو معیشت کے حوالے سے، موجودہ اِصطلاح میں ''طلب ورسد کا نظام'' (Law of Demand and Supply) کہا جاتا ہے۔
''طلب ورسد'' کا قدرتی نظام یہ ہے کہ جس چیز کی ''رسد'' (دستیابی یا فراہمی) کم ہو، اور

''طلب'' (مانگ) زیادہ، تو اس چیز کی قیمت قدرتی طور پر بڑھ جاتی ہے، لہٰذا صنعتکار اور تاجر اس چیز میں زیادہ نفع دیکھ کر اپنا سرمایہ اور وسائل اس کی تیاری اور فراہمی میں لگانے لگتے ہیں، اور جب ''طلب'' کے مقابلے میں ''رسد'' بڑھ جائے، یعنی وہ چیز بازار میں فراوانی کے ساتھ پائی جانے لگے اور گاہک اتنے نہ ہوں، تو اس کی قیمت قدرتی طور پر گھٹ جاتی ہے، چنانچہ اس کی مزید تیاری نفع بخش نہیں رہتی، اور وسائلِ پیداوار کا زائد حصہ اس کے بجائے دُوسرے ایسے کاموں میں صَرف ہونے لگتا ہے جن کی ضرورت معاشرے کو زیادہ ہو۔ اس طرح تاجر اور صنعتکار بہتر نفع حاصل کرنے کے لئے قدرتی طور پر معاشرے کی ضروریات فراہم کرتے ہیں، اور ساتھ ہی قیمتوں میں توازن برقرار رہنے کا عمل خود بخود جاری رہتا ہے۔

''طلب و رسد'' کا یہ قدرتی نظام جس طرح اشیائے صَرف اور مصنوعات میں کارفرما ہے، اسی طرح صنعتی تعلقات میں بھی اپنا بھرپور کردار اَدا کرتا ہے، کیونکہ تاجروں، صنعتکاروں اور زمینداروں کو مزدوروں اور کارکنوں کی ''طلب'' ہوتی ہے جن کے بغیر نہ تجارت وصنعت کا پہیہ چل سکتا ہے نہ زراعت و باغبانی اپنے برگ و بار لاسکتی ہے۔ اِدھر مزدوروں اور کارکنوں کو روزگار کی ''طلب'' ہوتی ہے، باہمی احتیاج کے اس قدرتی نظام کے تحت دونوں فریق ایک دُوسرے کے لئے ''رسد'' بن کر ایک دُوسرے کی ضرورت پوری کرتے ہیں۔ جہاں اَفرادی قوت (کارکن) کم اور وسائلِ روزگار زیادہ ہوں وہاں تنخواہیں اور اُجرتیں زیادہ ہوتی ہیں، اور جہاں معاملہ برعکس ہو کہ اَفرادی قوت زیادہ اور وسائلِ روزگار کم ہوں تو تنخواہیں اور اُجرتیں کم ہوتی ہیں۔

یہاں بھی کارکنوں کی اُجرت اور آجر (Entrepreneur) کے منافع میں توازن ''طلب و رسد'' ہی کا قدرتی نظام قائم رکھتا ہے، بشرطیکہ وہ مصنوعی جکڑبندیوں سے آزاد ہو، یعنی ہر شخص اس بات کا فیصلہ خود کرتا ہے کہ جتنے فرائض اور ذمہ داریاں میں نے اپنے ذمہ لی ہیں ان کا کتنا معاوضہ میرے لئے کافی ہے، اس سے کم ملے تو یہ کام کرنے پر راضی نہ ہو، اور

زیادہ مانگنے لگے تو کام لینے والا اس سے کام نہ لے، ہر شخص اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے دُوسرے کو اتنا دینے پر مجبور ہے جتنے کا وہ مستحق ہے۔

یوں ''طلب و رسد'' کے اس قدرتی نظام کو اگر آزاد رکھا جائے تو اس کے تحت معاشرے کی ضروریات با آسانی پوری ہونے کے علاوہ مستأجر (آجر) کے منافع، کارکنوں کی اُجرت، اور اشیائے صَرف کی قیمتوں میں ایک ہمہ گیر قدرتی توازن قائم رہتا ہے جس کے بغیر ایک خُوشحال معاشرے کی تعمیر کا خواب دیکھا تو جا سکتا ہے شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

قرآنِ حکیم نے اس قدرتی نظام کی طرف یہ فرما کر توجہ دِلائی ہے کہ:

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا

''دُنیاوی زندگی میں ہم ہی نے ان کے درمیان ان کی معیشت کو تقسیم کر رکھا ہے، اور ہم نے ایک کے دُوسرے پر درجے بلند کئے، تاکہ ایک دُوسرے سے کام لیتا رہے۔'' (سورۃ الزخرف: ۳۲)

اس آیت نے یہ حقیقت کھول کر بتا دی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں کے ذرائعِ معاش کی تقسیم کا کام نہ تو (سوشلزم کی طرح) حکومت اور افسر شاہی کے حوالے کیا ہے نہ (جاگیرداری و سرمایہ داری نظام کی طرح) چند افراد اور خاندانوں کے رحم و کرم پر چھوڑا ہے، بلکہ اپنی حکمتِ بالغہ سے دُنیا کا نظام ہی ایسا بنا دیا ہے کہ اگر حکومت یا بااثر طبقات کی طرف سے (اِرتکازِ دولت کے بل بوتے پر اور اپنی اِجارہ داریاں قائم کر کے) مصنوعی رُکاوٹیں کھڑی نہ کی جائیں تو ہر شخص اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے دُوسروں کو اتنا دینے پر مجبور ہے جتنے کے وہ مستحق ہیں۔ اور ہر شخص کے دِل میں وہی کام ڈال دیا ہے جو اس کے لئے زیادہ مناسب ہے، اور جسے وہ بہتر طریقے سے انجام دے سکتا ہے، چنانچہ ہر شخص، خواہ وہ ایک خاکروب ہی کیوں نہ ہو، اپنے کام میں مگن ہے اور اسی میں کمال پیدا کرنے کو اپنے لئے سرمایۂ فخر سمجھتا ہے۔

اسلام نے دولت کی پیدائش اور اس کی تقسیم کا کام ''طلب ورسد'' کی انہی فطری قوتوں سے لیا ہے، اور عام حالات میں اسے کسی انسانی اِدارے یا گروہ کے حوالے نہیں کیا تاکہ ''طلب ورسد'' کی آزادی برقرار رہے، اور صنعت وتجارت اور بازار اپنی طبعی رفتار سے آزادانہ طور پر ایک خوشحال معاشرے کی تعمیر میں بھرپور کردار ادا کرتے رہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ آجر (Entrepreneur) کے منافع، کارکنوں کی اُجرت، اور اَشیائے صَرف کی قیمتوں میں توازن رکھنے اور معیشت کو عام خوشحالی کی طرف گامزن کرنے کے لئے ''طلب ورسد'' کے قدرتی نظام کو ان رُکاوٹوں اور حیلوں سے بچانا ضروری ہے جو اس کی آزادی میں خلل انداز ہوتے ہوں، چنانچہ اسلام کی معاشی تعلیمات نے ایک طرف تو اِرتکازِ دولت ہی پر ضربِ کاری لگائی ہے، جو طلب ورسد کی آزادی کا گلا گھونٹنے کا بنیادی سبب ہے، دُوسری طرف ان فطری قوتوں کی حوصلہ افزائی اور تحفظ کے لئے ہر اس چور دروازے کو بند کردیا ہے جس سے عوام کی اس آزادی پر شب خون مارا جاسکے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) ''اِحتکار'' (ذخیرہ اندوزی) کی ممانعت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے کہ:

''من احتکر فھو خاطیء''

''جو شخص ذخیرہ اندوزی کرے وہ خطاکار ہے۔''[۱]

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے کہ:

''من احتکر علی المسلمین طعامًا ضربه اللہ بالجذام والإفلاس۔''

''جو شخص کھانے کی اشیاء کی ذخیرہ اندوزی کر کے مسلمانوں کو تکلیف میں ڈالے گا، اللہ اُس پر جذام (کوڑھ پن) اور اِفلاس کو مسلط

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، حدیث: ۴۰۰۰۔

کردے گا۔"[۱]

اس حدیث میں ذخیرہ اندوزی کرنے والے کی سزا جذام اور اِفلاس بتائی گئی ہے، کیونکہ وہ مخلوقِ خدا کی غذائی رسد میں رُکاوٹ ڈال کر انہیں تکلیف میں مبتلا کرتا ہے، (یہ اور بات ہے کہ اس کی کسی نیکی کے باعث اللہ تعالیٰ یہ سزا اس سے روک دے یا اُسے ڈھیل دینے اور سخت ترین سزا دینے کے لئے سزا کو آخرت تک مؤخر کردے۔) اسلامی حکومت جو سزا دے گی وہ اس کے علاوہ[۲] ہے۔

(۲) آڑھت کا جواز بھی مشروط

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ:

"لا یبع حاضر لباد، دعو الناس یرزق اللہ بعضهم من بعض۔"

"کسی دیہاتی کا مالِ تجارت فروخت کرنے کے لئے کوئی شہری اس کا وکیل (ایجنٹ) نہ بنے، لوگوں کو آزاد چھوڑو، تاکہ اللہ ایک کو دُوسرے سے رزق پہنچائے۔"[۳]

اس ممانعت کی علت (یا حکمت) کی طرف خود اسی حدیث کے آخری جملے میں اِشارہ فرمادیا گیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خریدار کو رِزق تاجر سے دِلواتا ہے اور تاجر کو خریدار سے، بیچ کے کسی شخص (Middle Man) کو اس خدائی نظام میں مداخلت اور

۱۔ ابنِ ماجہ فی التجارات، حدیث:۲۱۵۵، قال الهیثمی فی مجمع الزوائد اسنادہ صحیح ورجالہ موثقون۔

۲۔ مالِ تجارت کو ذخیرہ کرنے کی بعض صورتیں جن سے عوام کو ضرر لاحق نہیں ہوتا جائز بھی ہیں، تفصیل کتبِ فقہ میں دیکھی جائے۔

۳۔ صحیح مسلم فی البیوع، حدیث:۳۷۰۹۔

رکاوٹ ڈالنے کی اجازت نہیں، اگرچہ وہ اس تاجر کا بھائی یا باپ[۱] ہی کیوں نہ ہو، کیونکہ باہر کا آدمی مال شہر میں لاکر خود فروخت کرے گا تو بلا تاخیر بیچ کر فارغ ہونا چاہے گا، اور اپنا مناسب نفع رکھ کر بھی سستا بیچے گا، اور شہر کا آدمی (آڑھتی) بیچ میں آجائے گا تو روک روک کر مہنگا فروخت کرے گا، جس سے شہریوں کی ''رسد'' میں رُکاوٹ پیدا ہوگی اور مہنگائی بڑھے گی، چنانچہ جمہور فقہاء اور ائمہ اَربعہ کا اس پر اِتفاق ہے کہ آڑھت کا ایسا کاروبار ناجائز ہے جو شہریوں کے لئے ضرر اور مہنگائی کا باعث ہو۔

(۳) جھوٹی ''طلب'' ظاہر کرنے (نَجش) کی ممانعت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ:

"لا تَنَاجَشُوْا"[۲] یعنی تم ''نَجش'' نہ کرنا۔

"نجش" اور "تناجُش" کی حقیقت یہ ہے کہ جب کسی چیز کا سودا ہو رہا ہو، کوئی تیسرا شخص جو سودا کرنے کا حقیقت میں اِرادہ نہیں رکھتا خریدار کو محض دھوکا دینے (جھوٹی مانگ ظاہر کرنے) کے لئے اس چیز کی زیادہ قیمت لگادے تاکہ اصل خریدار اس سے بھی زیادہ قیمت پر اسے خرید لے۔ جیسا کہ بعض نیلام کرنے والے اپنے کچھ آدمی جھوٹی بولی لگانے کے لئے مقرر کردیتے ہیں، یہ عمل بالاتفاق (بالاجماع) حرام ہے۔ اور یہ بھی ''رسد'' میں رُکاوٹ ڈالنے یعنی اُسے مہنگا کرنے کی ایک صورت ہے۔

(۴) سودے پر سودے (سوم علی سوم اخیہ) کی ممانعت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے کہ:

۱۔ چنانچہ صحیح مسلم ہی کی ایک روایت (نمبر ۲۷۱۱) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جملہ بھی منقول ہے کہ "وان کان اخاہ او اباہ" یعنی ''اگرچہ وہ شہری اس (دیہاتی) کا بھائی یا باپ ہی کیوں نہ ہو۔''

۲۔ صحیح مسلم، البیوع، حدیث: ۳۶۹۸و ۳۶۹۹و ۳۷۰۱۔

"لَا یَسُم الْمُسْلِمُ عَلٰی سَوْمِ اَخِیْهِ"

"کوئی مسلمان دُوسرے مسلمان کے سودے پر سودا نہ کرے۔"[1]

یعنی جب دو آدمیوں کے درمیان خرید وفروخت یا کرایہ داری یا ملازمت ومزدوری کا سوا طے پا رہا ہو، معاوضے پر باہمی رضا مندی بھی ہوگئی ہو، مگر ابھی سودا نہیں ہوا، اس حالت میں کوئی تیسرا شخص زیادہ معاوضہ دے کر وہ سودا نہ کرے، یہ عمل بھی بالاتفاق ناجائز ہے، کیونکہ اس سے دونوں گاہکوں کے درمیان عداوت جنم لیتی ہے اور پہلے گاہک کو جو چیز (رسد) مل رہی تھی اس میں رُکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

(۵) "تلقی الجلب" (باہر سے آنے والے مالِ تجارت کو شہر میں پہنچنے سے پہلے خریدنے) کی ممانعت

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے:

"ان رسول الله صلى الله عليه وسلم نهى ان تتلقى السلع حتّٰى تبلغ الأسواق۔"

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (شہر کے لئے) باہر سے آنے والے مالِ تجارت کو بازاروں میں پہنچنے سے پہلے خریدنے کی ممانعت فرمائی ہے۔"[2]

اس ممانعت کا بھی ایک اہم مقصد یہ ہے کہ شہر کے لئے باہر سے آنے والے مالِ تجارت (رسد) کو بعض تاجر بازار میں پہنچنے سے پہلے ہی خرید کر اس پر اپنی اِجارہ داری (Monopoly) قائم نہ کرلیں، اور لوگوں سے من مانی قیمت وصول نہ کرسکیں، کیونکہ مال اگر بازار میں آکر کھلے عام فروخت ہوگا تو چھوٹے بڑے بہت سے تاجر اِسے خریدیں گے،

---

[1] صحیح مسلم، البیوع، حدیث: ۳۶۹۶۔

[2] صحیح مسلم، حدیث: ۳۷۰۲۔ نیز دیکھئے صحیح مسلم ہی میں حدیث نمبر ۳۶۹۸ و ۳۷۰۴ تا ۳۷۰۶ و ۳۷۰۸۔

اور آپس کی مسابقت (کمپیٹیشن) کے نتیجے میں کوئی بھی تاجر اس کی قیمت من مانے طریقے پر نہیں بڑھا سکے گا۔

(۶) "بیعُ المبیع قبل القبض" (Sale Before Acquiring Possession) (خریدی ہوئی چیز کو وصول کرنے سے پہلے آگے فروخت کرنے) کی ممانعت

یہ طریقۂ تجارت آج کل بہت رائج ہے اور سٹہ (Speculation) میں داخل ہے کہ ایک چیز کا آرڈر کسی تاجر نے دُوسرے (مقامی یا بیرونِ ملک تاجر) کو دِیا، اس چیز کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس پر بیسیوں سودے ہو جاتے ہیں، جس تاجر نے مال کا آرڈر دیا، وہ اس مال کی وہاں سے روانگی سے پہلے ہی اسے نفع لے کر دُوسرے کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے، دُوسرا تیسرے کے ہاتھ، اور تیسرا چوتھے کے ہاتھ، اس طرح ہر خریدنے والا اس غائب مال پر نفع لے کر دُوسرے کے ہاتھ فروخت کرتا رہتا ہے، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ عام صارفین تک پہنچتے پہنچتے اس کی قیمت کہیں سے کہیں پہنچ کر کئی گنا ہو جاتی ہے، جو نفع بیچ کے سٹہ باز لے اُڑتے ہیں وہ سارا کا سارا صارفین کو اَدا کرنا پڑتا ہے۔

اسلام نے اس بظاہر "شریفانہ" لوٹ مار کا راستہ روکنے کے لئے یہ قانون بنا دیا کہ خریدی ہوئی چیز کو جب تک خریدار اپنے قبضے میں نہ لے لے وہ اسے آگے فروخت نہیں کر سکتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"مَنِ ابْتَاعَ طَعَامًا فَلَا يَبِعْهُ حَتّٰى يَسْتَوْفِيَهٗ۔"[1]

"جس نے کوئی کھانے کی چیز خریدی وہ اسے وصول کرنے سے پہلے فروخت نہ کرے۔"

یہ حدیثِ صحیح حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے ہے، اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث یہ روایت

---

[1] صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب بطلان بیع المبیع قبل القبض، حدیث نمبر ۳۸۱۱۔

کی ہے کہ:

"فَاِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ نَھٰی اَنْ تُبَاعَ السِّلَعُ حَیْثُ تُبْتَاعُ حَتّٰی یَحُوْزَھَا التُّجَّارُ اِلٰی رِحَالِھِمْ۔"[1]

"سامانِ تجارت جہاں خریدا جائے وہیں اُسے آگے فروخت کرنے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، یہاں تک کہ تاجر اُسے اپنے اپنے ٹھکانوں پر پہنچادیں (پھر آگے فروخت کرسکتے ہیں)۔"

اس مضمون کی اور بھی کئی احادیث قابلِ اعتماد اچھی سندوں کے ساتھ ثابت ہیں۔ اور شریعت کے اس قانون پر اُمت کا اجماع ہے۔ البتہ اس کی فقہی تفصیلات میں فقہاء کا اختلاف ہے۔[2]

یہ چند مثالیں یہ اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اسلام نے "طلب ورسد" (Demand and Supply) کو آزاد رکھنے کا اہتمام کیسی نکتہ رسی سے کیا ہے، اور اُس میں اَدنیٰ رُکاوٹ کو اور مصنوعی مہنگائی کے چھوٹے سے چھوٹے سوراخ کو بند کرنے کے لئے کیسے حکیمانہ اُصول مقرّر کئے ہیں، حتیٰ کہ اشیاء کی قیمتوں پر سرکاری کنٹرول کو بھی پسند نہیں کیا گیا، چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی گئی کہ آپ بازار میں فروخت ہونے والی چیزوں کی قیمتیں سرکاری طور پر مقرّر فرمادیں تو آپ نے فرمایا کہ:

"اِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْمُسَعِّرُ الْقَابِضُ الْبَاسِطُ الرَّازِقُ"

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ ہی قیمتیں مقرّر کرنے والا، وہی کمی کرنے والا، وہی

---

[1] سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: ۳۳۵۶ ج:۲ ص:۴۹۴۔ ورواہُ ابن حبان، رقم الحدیث: ۴۹۶۳، ج:۷ ص:۲۲۹۔ والحاکم فی المستدرک وَصَحَّحَہٗ، وقال فی التنقیح: سندہٗ جید، رقم الحدیث: ۲۲۷۱، ج:۲ ص:۴۶۔ ونقلہٗ فی فتح القدیر ج:۶ ص:۱۳۶ "فصل ومن اشترٰی شَیْئًا مما یُنقل"۔

[2] نووی شرح صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب بیع المبیع قبل القبض۔

بڑھانے والا، وہی رازق ہے۔[1]"

جس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طلب ورسد کے فطری اُصول مقرّر فرمادیئے ہیں جن سے قیمتیں فطری طور پر متعین ہوتی رہتی ہیں، اس فطری نظام کو چھوڑ کر مصنوعی طور سے قیمتیں متعین کرنا پسندیدہ نہیں۔

خلاصہ یہ کہ دِین ومذہب سے مادر پدر آزاد نظامِ سرمایہ داری (Capitalism) میں آزادی صرف خودغرض سرمایہ داروں کے حصے میں آتی ہے، طلب ورسد (Demand and Supply) کی فطری قوتیں، اور معیشت وتجارت اور بازاران کے محکوم ہوتے ہیں، غریب طبقے کے حصے میں محرومیوں کے سوا کچھ نہیں آتا، اس کے برخلاف اسلام کے معاشی نظام میں معیشت اور تجارت وبازار (چند دِینی، اَخلاقی اور معاشرتی پابندیوں کے ساتھ) آزاد ہوتے ہیں، اور سرمایہ داروں پر صرف ایسی پابندیاں ہوتی ہیں کہ وہ محض نفع اندوزی کے لئے اپنا سرمایہ ملک اور عوام کے مجموعی مفادات کے خلاف اور لوگوں کی دِینی اور اَخلاقی اقدار کے خلاف استعمال نہ کرسکیں، بازار اور وسائلِ معاش کی آزادی کو سلب نہ کرسکیں، اور طلب ورسد کی فطری قوتوں کو مصنوعی طور پر اپنے کنٹرول میں لاکر عوام پر رِزق کے دروازے تنگ نہ کرسکیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قومی دولت کا ذخیرہ چند خاندانوں میں سمٹنے کے بجائے پورے معاشرے میں رواں دواں رہتا ہے، وسائلِ معاش کی فراوانی ہوتی ہے، ہر انسان اپنی صلاحیت، محنت یا سرمایہ کے تناسب سے حلال کمائی کے مناسب مواقع حاصل کرسکتا ہے، ایک متوازن معیشت اور خوشحال معاشرہ وجود میں آتا ہے، اور ایک غریب انسان بچوں کا پیٹ پالنے اور ان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی غلامی پر مجبور نہیں ہوتا۔

---

[1] سنن ابوداوٗد (واللفظ لہٗ) باب فی التسعیر، حدیث نمبر:۳۳۰۷۔
وجامع الترمذی، باب ما جاء فی التسعیر، حدیث نمبر:۱۳۱۷۔
وابن ماجۃ، باب من کرہ أن یسعّر، حدیث نمبر:۲۲۰۰۔
والدارمی، باب فی النھی عن أن یسعّر، حدیث نمبر:۲۴۵۰۔

(٦)

جو مال ''ضمان'' (Risk) میں نہیں اُس سے نفع کمانا جائز نہیں

اسلامی معیشت کی چھٹی خصوصیت جو ایک فقہی قاعدۂ کلیہ کی حیثیت رکھتی ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث نے عطا کی ہے، یہ ہے کہ: ہر شخص کو اپنی کسی چیز سے نفع کمانے کا حق صرف اسی صورت میں ہے جبکہ اُس چیز کے نقصان کا خطرہ (Risk) بھی اُس کے ذمہ ہو، یعنی یہ جائز نہیں کہ آدمی اپنی چیز کا نفع تو خود اُٹھائے، اور اگر وہ چیز ضائع ہو جائے تو اس کا نقصان کسی اور شخص پر ڈال دیا جائے۔ دُوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ آدمی اپنی جس چیز کا نفع اُٹھائے گا اُس کے نقصان کا ضامن اور ذمہ دار خود وہی ہوگا، کسی اور پر اُس کی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

یہ انصاف پر مبنی ایک بڑا حکیمانہ اُصول اور قاعدۂ کلیہ ہے، جسے شرعی اِصطلاح میں "اَلْخَرَاجُ بِالضَّمَانِ" بھی کہا جاتا ہے، اور "اَلْغُنْمُ بِالْغُرْمِ" بھی، اس کا اثر تجارت ومعیشت کے بہت سارے مسائل پر پڑتا ہے، اور یہ اشیائے ضرورت کی مہنگائی بڑھانے کے ایک چور دروازے کو بھی بند کرتا ہے، جیسا کہ آگے معلوم ہوگا۔ چونکہ نظامِ سرمایہ داری اس اُصول کا پابند نہیں، اس لئے دُوسرے بہت سے مسائل کی طرح وہ ان مسائل میں بھی اسلامی تعلیمات سے متصادم نظر آتا ہے، اور اپنے مزاج کے مطابق غریب عوام کی معاشی مشکلات میں اِضافے کا باعث بنتا ہے۔

ممانعت کی احادیث

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"اَلْخَرَاجُ بِالضَّمَانِ"

"نفع کا استحقاق ضمان کی وجہ سے ہوتا ہے۔"[1]

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"لَهٗ غُنْمُهٗ وَعَلَيْهِ غُرْمُهٗ"

"جس کے لئے نفع ہے، اُسی پر اس کا ضمان ہے۔"[2]

ایک اور حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خرید وفروخت کی بعض صورتوں سے منع فرمایا ہے، اُسی میں یہ بھی فرمایا کہ:

"وَلَا رِبْحُ مَا لَمْ يَضْمَنْ"

---

[1] سنن ابی داوٗد، باب فیمن اشترای عبدًا فاستعمله ثم وجَد بِهٖ عیبًا (ج:۳ ص:۲۸۴)، ورواهُ ابوداوٗد بثلاث طرق عن عائشة اثنتان رجالهما رجال الصحیح (قاله الشوکانی فی نیل الاوطار)۔ ورواهُ الترمذی فی جامعه وقال: "هٰذا حدیث حسن صحیح"۔ ورواهُ ابن ماجة فی سننه ج:۲ ص:۷۵۴۔ والحاکم فی المستدرك بطرقٍ ستة، رقم الحدیث:۲۱۷۶ (إلی) ۲۱۸۱، ج:۲ ص:۱۸۔ وقال الذهبی فی التلخیص "صحیح"۔ ورواهُ ابن حبان فی صحیحه ج:۱۱ ص:۲۹۹، رقم الحدیث:۴۹۲۸۔

[2] رواهُ البیهقی فی سننه الکبرٰی عن ابی هریرة، قال علیؒ: "هٰذا اسناد حسن متصل" حدیث نمبر:۱۱۰۰۲، ج:۶ ص:۳۹، باب الرهن غیر مضمون۔ والحاکم فی المستدرك بسبع طرق، حدیث نمبر:۲۳۱۵ تا ۲۳۲۱۔ وقال الذهبی فی التلخیص: "علی شرط البخاری ومسلم ولم یخرجاهُ لاختلافهم علی الزهری، وتابعه مالك وابن ابی ذئب وجماعة عن الزهری۔ کتاب البیوع ج:۲ ص:۵۸۔

''اور ایسے مال کا نفع کمانا بھی جائز نہیں جس کا وہ ضامن نہیں۔''[1]

اور یہ بات عقل و شرافت اور اِنصاف سے بھی بعید اور خود غرضی ہے کہ انسان اپنی کسی چیز کے منافع تو خود حاصل کرے اور اس کی مؤنت اور نقصان کی ذمہ داری دُوسرے پر ڈال دے۔ چنانچہ شریعت کے اس قاعدۂ کلیہ پر اُمت کا اِجماع[2] ہے۔ البتہ اس کی کچھ تفصیلات میں فقہائے کرام کا اِختلاف ہوا ہے، جن کے بیان کا یہ موقع نہیں۔

ملکیت اور ضمان کا فرق

تشریح اس قاعدے کی یہ ہے کہ ایک چیز ہے کسی مال کا کسی کی ملکیت میں ہونا، اور دُوسری چیز ہے اُس مال کا کسی کے ''ضمان'' (Risk) میں ہونا۔ ضمان میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ مال تباہ یا ضائع ہوگیا تو یہ نقصان اُسی شخص پر پڑے گا جس کے ضمان (Risk) میں وہ مال تھا، کسی اور پر اس کی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

خلاصہ یہ کہ ہر مال سے متعلق دو چیزیں ہوتی ہیں، ایک اُس کی ملکیت، دُوسری اُس کا ضمان (Risk)، یعنی اس کے نقصان کے خطرے کی ذمہ داری۔ بعض اوقات تو یہ دونوں چیزیں ایک ہی شخص کی ہوتی ہیں، یعنی مالک بھی وہی ہوتا ہے، ضامن بھی وہی، مالک

---

[1] پوری حدیث اس طرح ہے: عن عمرو بن شعیب، عن ابیه عن جده قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم: لا یَحِلُّ سَلَفٌ وَبَیعٌ ولَا شَرْطَانِ فِیْ بَیْعٍ، وَلَا رِبْحُ مَا لم یَضْمَن، وَلَا بَیْعُ مَا لَیْسَ عِنْدَكَ۔ رواهُ الحاکم فی المستدرك، قال الذهبی فی التلخیص: "صحیحٌ ورواهُ طائفةٌ" حدیث نمبر ۲۱۸۵، کتاب البیوع ج:۲ ص:۲۱۔ ورواهُ الترمذی فی جامعه ج:۲ ص:۵۳۵ حدیث نمبر ۱۲۳۴، باب ماجاء فی کراهیة بیع ما لیس عندك۔ وابن ماجة حدیث نمبر ۲۱۸۸ باب النهی عن بیع مالیس عندك وعن ربح مَالَمْ یضمن۔ ج:۲ ص:۷۳۷۔ ونسائی (المجتبٰی) ج:۷ ص:۲۹۵۔ والدارمی ج:۲ ص:۳۲۹ حدیث نمبر ۲۵۶۰۔ باب فی النهی عن شرطین فی بیع۔ یہ حدیث مزید چار صحابہ کرام سے بھی نقل کی گئی ہے، یعنی حضرت ابن عباس، حضرت یعلی بن اُمیہ، حضرت عتاب بن اُسید اور حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہم سے۔

[2] حاشیہ بذل المجهود ج:۴ ص:۲۸۹۔

ہونے کا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ اُسے حقوقِ ملکیت مل جاتے ہیں، وہ اُسے مالکانہ طور پر اِستعمال کرسکتا ہے، اس کی اجازت کے بغیر کوئی دُوسرا اسے استعمال نہیں کرسکتا وغیرہ وغیرہ۔

اور ضامن ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ مال ہلاک یا ضائع ہوجائے تو اس نقصان کی ذمہ داری کسی اور پر نہیں ہوتی، بلکہ یہ نقصان اُسے خود ہی برداشت کرنا پڑتا ہے۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کسی چیز کا مالک تو ہوتا ہے، ضامن نہیں ہوتا، بلکہ ضامن کوئی اور ہوتا ہے۔ مالک ہونے کا فائدہ تو وہی ہوتا ہے جو اُوپر بیان ہوا، اور ضامن نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مال اگر ہلاک ہوجائے تو یہ نقصان اس پر نہیں پڑتا، بلکہ وہ مال جس شخص کے ضمان میں تھا اُسی کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

کوئی چیز ضمان میں کب آتی ہے؟

جب ملکیت اور ضمان کا فرق واضح ہوگیا تو اب شریعت کے اس مسئلے کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ جب کسی مال کی فروخت کا عقد (Sale Contract) ہوجاتا ہے تو اس مال کی ملکیت تو اُسی وقت فروخت کرنے والے (بائع) کی طرف سے خریدار (مشتری) کی طرف منتقل ہوجاتی ہے، مگر ضمان اُس وقت تک منتقل نہیں ہوتا جب تک وہ مال خریدار (مشتری-Buyer) کے قبضے میں یا اُس کے نمائندے کے قبضے میں نہ آجائے، یعنی ضمان صرف بیع (Sale Contract) سے منتقل نہیں ہوتا، بلکہ قبضے سے منتقل ہوتا ہے، قبضہ منتقل ہونے سے پہلے وہ حسبِ سابق بائع (Seller) کے ضمان میں رہتا ہے۔ اور خریدار کے قبضے میں آتے ہی وہ خریدار کے ضمان میں آجاتا ہے۔

مثلاً آپ نے کوئی گاڑی خریدی، جیسے ہی خریداری کا عقد (Sale Contract) مکمل ہوا اس کے مالک تو آپ اُسی وقت ہوگئے، مگر جب تک اُس پر آپ کو یا آپ کے کسی نمائندے کو قبضہ نہیں ملا، وہ گاڑی آپ کے ضمان میں نہیں آئی بلکہ فروخت کرنے والے ہی کے ضمان میں ہے۔ چنانچہ اس حالت میں اگر وہ گاڑی کسی آفتِ سماوی سے تباہ ہوگئی، یا ڈاکو چھین کر لے گئے، تو یہ نقصان آپ پر نہیں پڑے گا کیونکہ گاڑی اُس وقت تک آپ کے

ضمان میں نہیں آئی تھی، بلکہ فروخت کرنے والے پر پڑے گا کیونکہ گاڑی اُسی کے قبضے میں ہونے کی وجہ سے اُسی کے ضمان میں تھی۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ نے گاڑی کا جو سودا کیا تھا، وہ خود بخود ختم ہو جائے گا، اور اُس گاڑی کی قیمت ادا کرنے کے آپ ذمہ دار نہیں رہیں گے۔ اور اگر وہ گاڑی آپ کے قبضے میں آنے کے بعد ہلاک ہوئی تو یہ نقصان آپ پر پڑے گا۔

مذکورہ خصوصیت کی مزید تفصیل

جب یہ بات بھی واضح ہوگئی تو اَب اُس خصوصیت کی کچھ مزید تفصیل بیان کرتا ہوں جو اُوپر عنوان میں آئی ہے کہ ''جو مال آپ کے ضمان میں نہیں اُس سے نفع کمانا بھی آپ کو جائز نہیں۔

پیچھے اسلامی معیشت کی پانچویں خصوصیت کے نکتہ نمبر ۶ میں جو مسئلہ آپ نے پڑھا ہے کہ: خریدی ہوئی چیز کو وصول کرنے (قبضے میں لینے) سے پہلے اُسے آگے فروخت کرنا جائز نہیں، اُس کی ایک بڑی وجہ یہی قاعدہ ہے جو یہاں بیان ہو رہا ہے، کیونکہ خریدی ہوئی چیز کو اپنے قبضے میں لینے سے پہلے اگر آپ اُسے آگے فروخت کریں گے تو اس فروخت سے حاصل ہونے والا نفع ایسی چیز کا نفع ہوگا جو آپ کے ضمان میں نہیں تھی، حالانکہ جو چیز آپ کے ضمان میں نہیں اس کا نفع لینا جائز نہیں۔

اس حکیمانہ اُصول کے ذریعے مہنگائی کے ایک چور دروازے کو بھی شریعت نے بند کیا ہے جس کی تفصیل وہاں اُس مسئلے کے ضمن میں آچکی ہے۔

پھر یہ قاعدہ صرف خرید و فروخت ہی سے متعلق نہیں، بلکہ شریعت میں جہاں بھی کسی مملوک شیٔ سے اِنتفاع کی اجازت ہے اسی قید کے ساتھ ہے کہ اس کے نقصان و مؤونت کی ذمہ داری ادا کرے۔

مثلاً مشارکت کا معاملہ اس شرط کے ساتھ جائز ہے کہ ہر شریک نفع و نقصان دونوں میں شریک ہو، اگر کوئی شریک صرف نفع میں شریک ہو، نقصان میں شریک نہ ہو تو یہ

معاملہ ناجائز ہو جاتا ہے۔

اسی طرح مُضاربت[1] میں اگر ربُّ المال صرف نفع میں شریک ہو، نقصان کی ذمہ داری نہ لے تو یہ مضاربت ناجائز ہے۔

اسی طرح کسی کو ودیعت (امانت کے طور پر لی ہوئی چیز) سے اِنتفاع اور اُسے اپنے اِستعمال میں لانا اسی لئے ناجائز ہے کہ وہ اُس کے ضمان میں نہیں ہوتی، لیکن جب مالک سے اجازت لے کر اُسے اِستعمال کرے گا تو نقصان کا ضامن بھی ہوگا۔

اسی طرح سود کے حرام ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس میں قرض دیئے ہوئے اُس مال کا نفع (Interest) لیا جاتا ہے جو قرض دینے والے کے ضمان میں نہیں، یعنی اگر وہ مال قرض لینے والے کے پاس ہلاک یا ضائع ہو جائے تو ضمان قرض دینے والے پر نہیں آتا۔

[1] مُضاربَت یہ ہے کہ مال ایک شخص کا ہو، جسے "ربُّ المال" کہا جاتا ہے، اور کام دُوسرے شخص کا ہو جسے "مضارب" کہتے ہیں، اور نفع میں دونوں شریک ہوں۔

(۷)

"غَرَر" (مبہم اور غیر یقینی سودوں) کی ممانعت

اسلامی معیشت کی ساتویں بنیادی خصوصیت جو دُوسرے معاشی نظاموں سے اسے ممتاز کرتی ہے یہ ہے کہ ایسے تمام سودوں اور معاملات ("عقود"، Agreements /Contracts) کو ناجائز قرار دے دِیا گیا ہے جن میں "غَرَر" پایا جاتا ہو۔

"غَـــرَر" عربی لفظ ہے، اس کے ایک لغوی معنیٰ دھوکے کے ہیں، لیکن شرعی اِصطلاح میں "غَرَر" کی حقیقت جو فقہی مسائل میں غور کرنے سے معلوم ہوتی ہے یہ ہے کہ "غَرَر" کی دو صورتیں ہیں:

"غَرَر" کی دو صورتیں

۱- ایک یہ کہ کسی معاملے (عقد) میں ایسا ابہام ہو کہ اس کی وجہ سے عموماً فریقین کے درمیان نزاعات پیدا ہوتے ہوں (یا کسی ایک فریق کو اس نزاع کے جھمیلے سے بچنے کے لئے اپنے نقصان پر مجبوراً صبر کرنا پڑتا ہو) ایسے ابہام کو فقہی اِصطلاح میں "جَهـالَـت" کہا جاتا ہے۔ یہ ابہام یا جہالت بیع (Sale) میں ہو یا اِجارے (Employment/Lease) میں "غَرَر" ہے اور ناجائز ہے۔

یہ ابہام یا جہالت تین طرح سے ہوسکتی ہے:

ایک یہ کہ خریدی گئی چیز (مَبِیْـع) کی ذات، یا نوعیت، یا مقدار نامعلوم یعنی مجہول ہو (جس کی مثال آگے آئے گی)۔

دُوسری یہ کہ خریدی گئی چیز کا عوض ("ثمن" Price) مجہول ہو۔

تیسری یہ کہ اگر سودا ("عقد" Contract) اُدھار کا ہوا ہے تو اس اُدھار کی

ادائیگی کی مدّت معلوم اور متعین نہ ہو، مجہول ہو۔

"غَرَر" کی دُوسری صورت

۲- "غَرَر" کی دُوسری صورت یہ ہے کہ کوئی معاملہ ("عقد"، Contract) غیر یقینی اور مشکوک ہو، یعنی یہ معلوم نہ ہو کہ وہ حتمی صورت اِختیار کر پائے گا یا نہیں، یعنی باقی رہے گا یا ختم ہو جائے گا۔

غیر یقینی اور مشکوک ہونے میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ فریقین نے ایک دُوسرے سے جو چیز (مثلاً مبیع یا ثمن) لینے کا سودا کیا ہے، وہ چیز ملے گی بھی یا نہیں؟

خلاصہ یہ کہ ہر وہ عقد جس میں مذکورہ بالا قسم کا ابہام (جہالت) ہو، یا وہ مذکورہ بالا حد تک غیر یقینی اور مشکوک ہو، اسلامی تعلیمات کی رُو سے ناجائز ہے۔

تجارت اور باہمی لین دین میں "غَــــرَر" کے مختلف معاملات (عقود) زمانۂ جاہلیت سے چلے آرہے تھے جن کی ممانعت قرآن وسنت نے صریح طور پر الگ الگ بھی کی ہے، مثلاً قمار (جُوا) کہ اُس کی حرمت ومذمت قرآنِ حکیم نے سخت الفاظ میں تاکید سے فرمائی ہے[1] جیسا کہ اسی مقالے میں خصوصیت نمبر ۵ میں تفصیل سے آچکا ہے، قمار کے حرام ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اس میں شدید قسم کا "غَــــرَر" پایا جاتا ہے جو عداوتوں اور دُشمنیوں کو جنم دیتا ہے۔

اور مثلاً "بَیْعُ المُلامَسة، بَیْعُ المُنَابَذة، بَیْعُ الحَصاۃ[2]، بَیْعُ حَبْلِ الحَبلَة، اور بَیْعُ المَبِیْع قبل القبض" وغیرہ، کہ غرر کی وجہ سے احادیثِ نبویہ میں ان کی صریح ممانعت آئی ہے (کتبِ حدیث وفقہ میں ان کی تفصیلات دیکھی جاسکتی ہیں) پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قاعدۂ کلیہ کے طور پر بھی "غَــرَر" کی ممانعت اس طرح فرمادی

[1] سورۃ المائدۃ، آیت (۹۰و۹۱)۔

[2] بیع الحصاۃ کی تشریح آگے آرہی ہے۔

ہے کہ اس ممانعت میں "غَرَر" والے وہ سارے معاملات (عقود) بھی آ گئے جو پہلے سے رائج تھے، اور ایسے تمام عقود بھی جو آئندہ قیامت تک پیدا ہوں یا ایجاد کئے جائیں، چنانچہ صحیح مسلم[۱] اور دُوسری کتبِ حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ بیان سندِ صحیح کے ساتھ آیا ہے کہ:

"نهى رسولُ الله صلى الله عليه وسلّم عن بيع الحصاة وعن بيع الغَرَر"

ترجمہ:- "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "کنکر کی بیع (Sale)" سے منع فرمایا ہے، اور "غَرَر" کی بیع (Sale) سے بھی۔"

"کنکر کی بیع" کے دو طریقے رائج تھے، ایک یہ کہ بائع یعنی فروخت کرنے والے کے پاس مختلف قسم کی چیزیں مثلاً کپڑے وغیرہ ہیں، وہ خریدار سے کہتا ہے کہ تم ان پر کنکر پھینکو، جس چیز یا کپڑے کو وہ لگ جائے وہ اتنے (مثلاً ۵ روپے) میں تمہارے ہاتھ فروخت کیا، زمانۂ جاہلیت میں جب یہ بیع کر لی جائے تو جائز بیع کی طرح یہ بھی لازم سمجھی جاتی تھی، یعنی خرید و فروخت کرنے والوں میں سے کسی کو اسے ختم کرنے کا اِختیار نہیں ہوتا تھا، خواہ وہ کنکر ایک روپے کی چیز پر گری ہو یا سو روپے کی چیز پر، نیز خواہ وہ کتنی ہی عیب دار ہو یا بالکل ٹھیک حالت میں ہو۔

بَیْعُ الحَصَاة (کنکر کی بیع) کا دُوسرا طریقہ یہ تھا کہ کوئی آدمی اپنی زمین کسی کو یہ کہہ کر فروخت (Sale) کرتا تھا کہ تم یہاں سے کنکر یا پتھر پھینکو جہاں جا کر یہ گرے گا، وہاں تک کی زمین میں نے تمہارے ہاتھ (مثلاً) دس ہزار روپے میں فروخت کی۔

ان دونوں طریقوں میں خریدی گئی چیز کا عوض یعنی "ثمن" (مثلاً پہلی صورت میں ۵ روپے اور دُوسری صورت میں دس ہزار روپے) تو متعین اور معلوم ہے، یعنی اس میں

---

[۱] صحيح مسلم، كتاب البيوع، باب بطلان بيع الحصاة والبيع الذى فيه "غرر" ج:۲ ص:۲۔

کوئی ابہام نہیں، مگر ثَـمَـن کے مقابلے میں جو چیز خریدار کو ملنے والی ہے وہ بالکل مُبہم، غیر متعین اور مجہول ہے، اس میں کسی ایک فریق کو تو بڑا نفع مل سکتا ہے اور دُوسرے فریق کو بہت بڑا نقصان ہو جانے کا قوی اندیشہ ہے، خصوصاً جبکہ یہ سودا لاکھوں کروڑوں روپے کی اشیاء میں ہو، ظاہر ہے اس کے نتیجے میں عداوتیں، دُشمنیاں اور نزاعات پیدا ہوں گے، چنانچہ یہ بیع بھی "بَیْعُ الْغَرَر" میں داخل اور شرعاً ناجائز ہے۔

یہ تشریح تو مذکورہ بالا حدیث شریف کے پہلے جملے (کنکر کی بیع) سے متعلق ہوئی، اس میں "غَرَر" کی پہلی صورت یعنی ابہام (جہالت) کی دو مثالیں سامنے آئی ہیں۔

اس حدیث کے دُوسرے جملے "وَعَنْ بَیْعِ الْغَرَر" (غَرَر کی بیع) میں قاعدۂ کلیہ کے طور پر "غَـرَر" کی دونوں صورتوں کی ممانعت آگئی ہے، یعنی ایسے تمام معاملات (عقود) کی بھی جن میں ابہام (جہالت) ہو، اور ایسے تمام معاملات کی بھی جو غیر یقینی اور مشکوک ہوں۔

"غیر یقینی اور مشکوک" ہونے میں بنیادی طور پر مندرجہ ذیل تین طرح کے عقود (سودے، معاملات) آتے ہیں:

۱- ایسی چیز فروخت کی جائے جو فروخت کرنے والا، خریدار کو فی الحال سپرد کرنے پر قادر نہیں، مثلاً پرندہ جو ہوا میں اُڑ رہا ہو، یا مچھلی جو ایسے پانی میں ہو جو بائع (فروخت کرنے والے) کی ملکیت میں نہیں، یا مثلاً جانور کا بچہ جو ابھی حمل کی صورت میں ماں کے پیٹ میں ہو۔

۲- سودے ("عقد" Contract) کو ایسی شرط کے ساتھ مشروط (مُعلّق) کیا گیا ہو کہ پتہ نہیں وہ شرط پائی بھی جائے گی یا نہیں؟ مثلاً کسی کا موبائل گم ہو گیا اُسے اُمید ہے کہ مل جائے گا مگر یقین نہیں، وہ اسی حالت میں موبائل کو کسی کے ہاتھ اس شرط کے ساتھ فروخت کر دیتا ہے کہ اگر وہ مل گیا تو تمہارے ہاتھ (مثلاً) ایک ہزار روپے میں فروخت کیا، یا مثلاً کسی نے اپنی گاڑی اس شرط کے ساتھ فروخت کی کہ اگر کل بارش ہو گئی تو یہ میں نے

تمہارے ہاتھ دس لاکھ روپے میں فروخت کی، ظاہر ہے کہ یہ صرف وعدہ نہیں بلکہ سودا (''عقد'' Contract) ہے، اگر صرف وعدہ ہوتا، یعنی فروخت کرنے والا یہ کہتا کہ: ''اگر کل بارش ہوگئی تو یہ گاڑی میں دس لاکھ روپے میں تمہارے ہاتھ فروخت کردوں گا'' تو اس میں کوئی خرابی نہیں تھی، ایسا وعدہ کرلینا جائز ہے، اور یہ ''غرر'' میں داخل نہیں، لیکن جو مثال ہم نے اُوپر لکھی ہے اس میں الفاظ وعدے کے نہیں، یعنی اس میں ''فروخت کردوں گا'' کے الفاظ نہیں، بلکہ ''فروخت کی'' کے الفاظ ہیں جو ''عقدِ بیع'' (Sale Contract) ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اگر کل بارش ہوگئی تو کسی نئے عقد یا سودے کی ضرورت نہیں ہوگی، آج کا کیا ہوا یہی عقد برقرار رہے گا اور مؤثر ہوجائے گا، اور اگر کل بارش نہ ہوئی تو یہ سودا (عقد) خودبخود ختم ہوجائے گا۔ اور اُوپر آچکا ہے کہ کسی سودے کو ایسی شرط کے ساتھ مشروط کردینا ''غَرَر'' میں داخل ہے، جائز نہیں، کیونکہ پتہ نہیں کل بارش ہوگی یا نہیں؟

۳- کسی چیز کی فروخت کو مستقبل کی طرف منسوب کیا جائے، یعنی کسی چیز کو فی الحال نہیں بلکہ اگلے زمانے سے آج فروخت کیا جائے، مثلاً دسمبر کے مہینے میں کوئی شخص دُوسرے سے کہتا ہے کہ میں نے اپنی یہ گاڑی تمہارے ہاتھ یکم فروری سے دس لاکھ روپے میں فروخت کی، اور دُوسرا اسے قبول کرلیتا ہے تو یہ سودا جائز نہیں، کیونکہ مستقبل کی طرف منسوب ہونے کی وجہ سے اس میں ''غَرَر'' ہے جو ناجائز ہے، اور اس میں ''غَرَر'' ہونے کی وجہ اس سودے کا غیریقینی اور مشکوک ہونا ہے، کیونکہ پتہ نہیں یکم فروری تک یہ گاڑی موجود بھی رہے گی یا نہیں؟ اور موجود رہی تو اس اُس وقت اس کی حالت کیا ہوچکی ہوگی؟ نیز خریدار کو اس کی سپردگی ممکن بھی ہوگی یا نہیں؟

''غَــرَر'' کے بہت سے طریقے زمانۂ جاہلیت (اسلام سے پہلے) سے چلے آرہے ہیں، قمار (جُوے) اور سٹے (Speculation) کے جتنے معاملات رائج تھے، یا ہیں، وہ سب اس لئے بھی ناجائز ہیں کہ ان میں ''غَــرَر'' پایا جاتا ہے۔ اور موجودہ دور تو

نظامِ سرمایہ داری (Capitalism) کا دور ہے، اس میں غرر کے اتنے طریقے رائج ہوگئے ہیں کہ شمار کرنا بھی آسان نہیں، یہاں چند مثالیں درج کرتا ہوں کہ یہ معاملات بھی غرر میں آتے ہیں، اور شرعاً ناجائز ہیں۔

موجودہ زمانے میں "غَرَر" کی چند مثالیں

۱- "شارٹ سیل" (Short Sale)

یعنی بائع (فروخت کرنے والا) ایسی چیز فروخت کرتا ہے جو اُس کی ملکیت میں نہیں، لیکن اُسے یہ اُمید ہوتی ہے کہ سودا (Sale Contract) ہوجانے کے بعد وہ اُسے بازار سے خرید کردے دے گا۔

آج کل یہ بیع (Sale) کثرت سے رائج ہے، یہ اجناس اور اَشیاء میں بھی ہوتی ہے، اور شیئرز (Shares "حِصَص") کے کاروبار میں بھی، اس کے ناجائز ہونے کی وجہ یہی ہے کہ اس میں "غَرَر" یعنی غیر یقینی اور مشکوک صورتِ حال ہے کہ پتہ نہیں مبیع (Subject Matter) یعنی فروخت کی جانے والی چیز بائع (Seller) کی ملکیت میں آئے گی بھی یا نہیں؟

۲- "غیر مقبوض کی بیع"

اسی سے ملتی جلتی "غیر مقبوض کی بیع" ہے، جسے فقہی اِصطلاح میں "بیع قبل القبض" کہا جاتا ہے، یعنی ایسی چیز فروخت کرنا جو بائع (Seller) کی ملکیت میں تو آگئی ہے، مگر اُس کے قبضے (Possession) میں نہیں آئی، اس میں بھی "غَرَر" پایا جاتا ہے، اور ناجائز ہے، کیونکہ پتہ نہیں وہ چیز بائع کے قبضے میں آئے گی بھی یا نہیں؟ اور یہ عقد باقی بھی رہے گا یا نہیں؟

مثلاً ''الف'' سے ''ب'' نے کار خریدی، یعنی عقدِ بیع (Sale Contract) مکمل ہوگیا، جس کی وجہ سے گاڑی کی ملکیت ''الف'' سے ''ب'' کی طرف منتقل ہوگئی، مگر ابھی وہ گاڑی ''الف'' نے نہ ''ب'' کے سپرد کی تھی نہ ''ب'' کے کسی نمائندے کی سپردگی (قبضے) میں دی تھی، اسی حالت میں ''ب'' نے وہ گاڑی ''ج'' کے ہاتھ فروخت کردی، یہ "بیع المبیع قبل القبض" ہوئی، اور ناجائز ہے، کیونکہ اس بیع کی حالت غیر یقینی اور مشکوک ہے، جو "غَرَر" میں داخل ہے۔

غیر یقینی اور مشکوک ہونے کی وجہ یہ ہے کہ بہت ممکن ہے کہ یہ گاڑی ''الف'' کے پاس ہی کسی وجہ سے تباہ ہوجائے، اور اگر ایسا ہوا تو ''الف'' اور ''ب'' کے درمیان جو عقدِ بیع (Sale Contract) ہوا تھا وہ فسخ (ختم) ہوجائے گا، اور اس کے ختم ہونے کی وجہ سے بعد میں ہونے والا وہ عقد بھی خود بخود ختم ہوجائے گا جو ''ب'' نے ''ج'' کے ساتھ اس گاڑی کا کیا تھا۔

"بیع قبل القبض" کی ممانعت، اور اس ممانعت کی معاشی حکمت و مصلحت، پیچھے اسلامی معیشت کی پانچویں خصوصیت کے نکتہ نمبر ۶ میں ضروری تفصیل کے ساتھ بیان کرچکا ہوں، وہیں اس ممانعت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث بھی مستند حوالوں کے ساتھ بیان ہوئی ہیں۔

نیز پیچھے اسلامی معیشت کی چھٹی خصوصیت میں بھی اس بیع کی ممانعت کا ذِکر آیا ہے، وہاں اس کی ایک اور خرابی کا بیان تفصیل سے ہوا ہے، وہ یہ کہ یہ بیع "رِبحُ مَا لَمْ یَضْمَنْ" کا ذریعہ بنتی ہے، یعنی اس کے ذریعے بائع ایسی چیز کا نفع حاصل کرتا ہے جو اُس کے ضمان (Risk) میں نہیں، حالانکہ یہ کھلی ناانصافی ہے کہ کسی چیز کا نفع تو آدمی خود حاصل کرے اور اس کے نقصان کی ذمہ داری دُوسرے پر ڈال دے۔ اس ناانصافی کی ممانعت کے بارے میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث وہاں بیان ہوئی ہیں، دوبارہ دیکھ لی جائیں۔

خلاصہ یہ کہ "بیع قبل القبض" میں شرعاً دو بڑی خرابیاں ہیں:

(۱) ایک ایسی چیز کا نفع حاصل کرنا جو بائع (Seller) کے ضمان (Risk) میں نہیں۔

(۲) دُوسری یہ کہ اس میں "غَرَر" ہے، جیسا کہ اُوپر بیان ہوا۔

غور کیا جائے تو یہی دونوں خرابیاں شارٹ سیل (Short Sale) میں بھی پائی جاتی ہیں، بلکہ زیادہ قوت کے ساتھ پائی جاتی ہیں، کیونکہ اُس میں تو آدمی ایسی چیز کا نفع حاصل کرتا ہے جو اُس کی نہ ملکیت میں ہے، نہ ضمان میں، اور "غَرَر" کا پایا جانا بھی اس میں زیادہ واضح ہے، جیسا کہ پیچھے بیان ہوا ــــــــــــ یہ دونوں قسم کے سودے سٹہ (Speculation) کا ذریعہ بنتے ہیں، اور آج کل تو بڑے پیمانے پر ذریعہ بنے ہوئے ہیں، کیونکہ سٹہ کھیلنے والے، چیز کو وصول کرنے کے اِرادے سے نہیں خریدتے، ان کی دِلچسپی صرف اس کی قیمت کے اُتار چڑھاؤ میں ہوتی ہے، وہ اُس چیز کے پے در پے کئی سودے کرنے کے بعد ایک دُوسرے سے صرف فرق (Difference) کی ادائیگی یا وصولی کرلیتے ہیں، یعنی لینا دینا اُس خریدی ہوئی چیز کا نہیں ہوتا، بلکہ مقصود اس کی قیمت کے فرق کا لینا دینا ہوتا ہے، اور اُس چیز کی خرید و فروخت صرف مصنوعی طور پر ہوتی ہے، اسی وجہ سے یہ سارا کاروبار، تجارت کے بجائے سٹہ اور جُوا (قمار) بن کر رہ جاتا ہے، جو بسا اوقات تجارتی بحرانوں (Crises) کا سبب بنتا ہے۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کی ممانعت اپنے اس حکم کے ذریعے بھی فرمائی ہے کہ:

"لَا تَبِعْ مَا لَيْسَ عِنْدَكَ"[۱]

---

[۱] جامع ترمذی ج:۱، "باب ما جاء فی کراھیة بیع ما لیس عندہ" حدیث نمبر ۱۲۳۲، عن حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ۔ قال الترمذی: "هٰذا حديثٌ حَسَنٌ"۔ وحدیث نمبر ۱۲۳۳، عن عبداللہ بن عمرو (بن العاص) رضی اللہ عنہ۔ وقال الترمذی فیہ: "وهٰذا حديثٌ حَسَنٌ صَحِيْحٌ"۔

ترجمہ:- ''ایسی چیز فروخت نہ کرو جو تمہارے پاس نہیں'' (یعنی تمہاری ملکیت اور قبضے میں نہیں ہے)۔

اس حدیث کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دو جلیل القدر صحابۂ کرام یعنی حضرت حکیم بن حزام اور حضرت عبداللہ بن عمرو (رضی اللہ عنہما) نے روایت کیا ہے۔

البتہ دو قسم کے عقد (سودے) اس ممانعت سے مستثنیٰ ہیں:

(۱) ''عقدِ سَلَم'' (۲) ''عقدِ استصناع'' کہ ان میں بھی بیع غیر مملوک اور غیر مقبوض اجناس و اشیاء کی ہوتی ہے، لیکن شرعاً جائز ہیں، جن کی تفصیل حدیث اور فقہ کی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے، ان کے جواز کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں قسم کے عقود کو ایسی شرطوں اور قیدوں کا پابند کر دیا گیا ہے کہ اُن کی موجودگی میں ایسا ''غَـرَر'' باقی نہیں رہتا جو فریقین کے درمیان نزاعات کا باعث بنتا ہو، اور معاشی سرگرمیوں کو غیر یقینی صورتِ حال سے دوچار کرتا ہو۔ اُن شرائط اور قیود کے بغیر یہ سودے (عقود) بھی شرعاً جائز نہیں ہوتے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں، اس کے لئے کتبِ فقہ کی مراجعت کی جائے۔

۳- قرضوں اور دُیون کی بیع (Sale of Debts)

''غَرَر'' والے سودوں ہی کی ایک قسم ''قرضوں اور دُیون کی بیع'' ہے، جو آج کل بہت بڑے پیمانے پر رائج ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ مثلاً ''الف'' کا قرضہ کچھ لوگوں کے ذمہ واجب الاداء ہے۔ ''الف'' یہ قرضہ ''ب'' کے ہاتھ فروخت کر دیتا ہے، ''ب'' یہ قرضہ اس اُمید پر خریدتا ہے کہ اُسے یہ، قرض داروں سے وصول ہو جائے گا، لیکن یہ بات یقینی نہیں، کیونکہ بالکل ممکن ہے کہ وہ سب، یا ان میں سے بعض نادہندہ (Defaulter) ہو جائیں، یعنی اپنے ذمہ کا قرض اداء نہ کریں، یا نہ کر سکیں، اگر ایسا ہوا تو ''ب'' اپنی اس رقم سے ہاتھ دھو بیٹھے گا جو اُس نے ''الف'' کو اَداء کی ہے، لہٰذا مشکوک اور غیر یقینی ہونے کی وجہ سے قرضوں اور دُیون کی بیع (Sale of Debts) بھی ''غَـــرَر''

میں داخل ہے، اور ناجائز ہے۔

اس عقد کے ناجائز ہونے کی ایک دُوسری وجہ بھی بہت بڑی ہے، وہ یہ کہ قرض اور دَین کو خریدنے والا قابلِ وصول رقم میں کٹوتی (Discounting) کرکے خریدتا ہے، یعنی جس قرض کو وہ خریدتا ہے وہ زیادہ ہوتا ہے، اور جس رقم کے بدلے خریدتا ہے وہ کم ہوتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی بیس ملین روپے کو اُنیس ملین روپے میں خریدے، ظاہر ہے کہ یہ رِبا اور سود ہے، جس کی حرمت کا بیان اس مقالے میں تفصیل سے اور بار بار آچکا ہے۔

حالیہ عالمی معاشی بحران![1]

پچھلے تقریباً دو سال سے تقریباً پوری دُنیا معاشی اور مالیاتی بحران (Financial Crises) کا شکار ہے، جس میں بڑے بڑے عالمی بنک دیوالیہ (Bankrupt) ہوگئے، برسوں سے خوب نفع کماتی ہوئی عالمی شہرت والی بڑی بڑی کمپنیاں اچانک بھاری نقصان کا خوفناک جھٹکا لے کر ڈھیر ہوگئیں، باقی بچنے والی کمپنیوں کے حصص (Shares) کی قیمتیں اتنی گرگئیں کہ مالکانِ حصص دیکھتے ہی دیکھتے اپنی دولت کے بہت بڑے حصے سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اس بحران کا آغاز تو امریکا سے ہوا، لیکن اس کے تباہ کن اثرات سے آج پوری دُنیا دوچار ہے، اور ہر ملک کو تجارتی اور معاشی مشکلات کا سامنا ہے، اس کا بہت بڑا سبب یہی قرضوں اور دُیون کی بیع (Sale of Debts) ہے، کیونکہ بہت سے لوگوں نے سودی قرضوں پر مکانات خریدے ہوئے تھے، جن کی وہ قسطیں اداء کر رہے تھے، جن مالیاتی اِداروں سے انہوں نے یہ قرضے لئے تھے ان اِداروں نے جلد نفع کمانے کی ہوس میں یہ

---

[1] یہ مقالہ تو اَب سے کئی برس پہلے کا لکھا ہوا تھا، اُس وقت یہ بحران رُونما نہیں ہوا تھا، اب جبکہ یہ مقالہ پہلی بار اِشاعت کے لئے جارہا ہے، تو اس بحران نے تقریباً پوری دُنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے، لہٰذا مناسب معلوم ہوا کہ اس کے بارے میں بھی بقدرِ ضرورت کچھ عرض کردیا جائے۔ (رفیع، مارچ ۲۰۱۰ء)۔

قرضے دُوسرے بڑے مالیاتی اِداروں کے ہاتھ نسبۃً کم قیمت میں فروخت کر دیئے، یعنی یہ قرضے سود سمیت جتنی رقم کے تھے اُس سے کچھ کم قیمت پر فروخت کر دیئے، جس کا حاصل درحقیقت یہ ہوا کہ سود میں سے کچھ کمی کر دی، نہ کہ اصل قرضے میں سے، تاکہ وہ حاصل شدہ قیمت سے مزید سودی قرضے جاری کر سکیں، اور خریدنے والے مالیاتی اِدارے ان قرضوں کو کٹوتی (Discounting) کے لالچ میں خریدتے چلے گئے، پھر انہوں نے بھی جلد نفع کمانے کے شوق میں یہ قرضے دُوسرے بڑے عالمی مالیاتی اِداروں کے ہاتھ نسبۃً کم قیمت میں فروخت کر دیئے، اس طرح ان قرضوں کی بیع در بیع ہوتی رہی، اور ہر خریدنے والا اِدارہ کچھ نفع (Discount) کما کر اِن قرضوں کی نادہندگی (Default) کا خطرہ دُوسرے اِداروں کی طرف منتقل کرتا چلا گیا یہاں تک کہ ان قرضوں کی مالی دستاویزات بنا کر انہیں ملک اور بیرونِ ملک بھی وسیع پیمانے پر بیچا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اُن مکانات کی قیمتیں گریں جن کے قرضوں سے یہ سلسلہ شروع ہوا تھا، تو خریدنے والوں نے محسوس کیا کہ اگر وہ مزید قسطیں اداء کرتے رہے تو مکانات کی جو کُل لاگت ان پر آئے گی وہ ان کی موجودہ بازاری قیمت سے بہت زیادہ ہوگی، لہٰذا انہوں نے اِن قرضوں کی ادائیگی روک دی، اس نادہندگی (Default) کی وجہ سے بہت سے مالیاتی اِداروں نے وہ مکانات ضبط کر لئے، مگر ضبط کئے ہوئے مکانات کی قیمتیں چونکہ گرچکی تھیں لہٰذا وہ قیمتیں قرضوں کی ادائیگی کے لئے ناکافی ہوگئیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں نے اربوں ڈالر کے یہ قرضے خریدے ہوئے تھے، ان کو اِحساس ہوا کہ قرض کی بنیاد پر کھڑے مالیاتی اثاثے ان کے تصوّر کے برعکس بالکل غیر محفوظ اور غیر یقینی ہیں، اس سے ہر طرف خوف وہراس پھیل گیا، اور قرض کی بنیاد پر قائم مالیاتی اِداروں اور بنکوں نے خوف زدہ ہو کر نئے قرضوں کا اِجراء روک دیا، جس کی وجہ سے قرض کی بنیاد پر چلنے والی کمپنیوں کو نقصان ہونے لگا، اور حصص (شیئرز) کی قیمتیں تیزی سے نیچے آگریں، جن لوگوں نے کروڑوں، اربوں روپے شیئرز (حصص) کے سٹہ میں لگا کر خطرہ مول لیا تھا، وہ مالی طور پر بدحالی کا شکار ہوگئے، اور اس ساری صورتِ حال کا

نتیجہ موجودہ عالمی معاشی بحران کی صورت میں ظاہر ہوا، جس کے بارے میں اندازہ کیا جارہا ہے کہ اس نے پوری دُنیا کی تقریباً ۴۵ فیصد دولت کا صفایا کر دیا ہے۔

یہ اس عالمی معاشی بحران کے صرف ایک پہلو کا بہت مختصر سا حال ہے، اس کی عبرت ناک داستان کے لئے اُس لٹریچر کا مطالعہ مفید ہوگا جو عالمی زبانوں میں اس دوران وجود میں آیا ہے، خصوصاً برادرِ عزیز مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کا مقالہ قابلِ دید ہے جو انہوں نے اسی موضوع پر لکھا ہے، اور سوئٹزرلینڈ کے ورلڈ اکنامک فورم (World Economic Forum) کے سالانہ اجلاس (منعقدہ جنوری ۲۰۱۰ء) میں پیش کیا تھا، یہ اِدارہ اس وقت معیشت کے معاملات میں دُنیا کا سب سے بڑا باوقار فکری اِدارہ سمجھا جاتا ہے، اور اس کے اس سالانہ اجلاس کا بنیادی موضوع یہی موجودہ ''عالمی معاشی بحران'' تھا۔ موصوف کا اصل مقالہ انگریزی میں ہے، اُردو ترجمہ بھی شائع ہورہا ہے۔ ولله الحمد وجزاه الله خير الجزاء۔

اس باب کا خلاصہ

پیچھے اسلامی معیشت کی جو خصوصیات سامنے آئی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱- معاشی سرگرمیاں اسلام کی نظر میں دِین سے الگ نہیں، دِین ہی کا ایک اہم حصہ ہیں، ہر معاشی عمل جو حسنِ نیت کے ساتھ ہو، اور شرعی حدود میں ہو، اسلام کی نظر میں عبادت کا درجہ پالیتا ہے، معاشی ترقی اس کی نظر میں پسندیدہ اور کسبِ حلال ایک درجہ میں فرض ہے۔

۲- لیکن مسئلۂ معاش کو اِسلام زندگی کا اصل مسئلہ اور فکر و عمل کا محوَر قرار نہیں دیتا، اور نہ معاشی ترقی اس کے نزدیک انسان کا منتہائے مقصود ہے، اصل مقصود اللہ تعالیٰ کی اطاعت و بندگی اور آخرت کی مکمل کامیابی ہے، لیکن چونکہ اس منزلِ مقصود کو دُنیا کی زندگی سے گزرے بغیر حاصل نہیں کیا جاسکتا اس لئے وہ تمام سرگرمیاں بھی ضروری ہوجاتی ہیں جو

دُنیا کی پُر امن و پُر سکون زندگی کے لئے ناگزیر ہیں۔

۳۔سب عاقل بالغ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہ ہیں، خواہ امیر ہوں، یا غریب، حاکم ہوں یا محکوم، اجیر (Labour) ہوں یا مستأجر (Entreprmecur)، سب کو آخرت میں برپا ہونے والے یومِ حساب میں اپنے ہر اچھے بُرے، اور چھوٹے بڑے عمل کا حساب دینا ہے، مال کس کس طرح کمایا اور کہاں کہاں خرچ کیا؟ اس کا بھی حساب دینا ہے، اور ہر ایک کو اپنے اپنے عمل کے مطابق جزا یا سزا پانی ہے۔

۴۔ اسلامی نظمِ معیشت میں وسائلِ معاش پر حکومت، جاگیرداروں یا سرمایہ داروں کی اِجارہ داری نہیں ہوتی، ہر شخص کو اپنی صلاحیت، محنت اور سرمایہ کے تناسب سے اس کا معقول صلہ حاصل کرنے کے کھلے مواقع میسر ہوتے ہیں۔

۵۔اسلام کی معاشی تعلیمات نے اِرتکازِ دولت کے سب دروازے بند کر دیئے ہیں تا کہ دولت کا ذخیرہ چند خاندانوں یا معاشرے کے خاص خاص طبقات میں سمٹنے کے بجائے زیادہ سے زیادہ وسیع پیمانے پر گردش کرے اور اَمیر و غریب کا تفاوت فطری اور قابلِ عمل حد تک کم کیا جائے۔

٦۔طلب و رسد (Demand and Supply) کی آزادی کا تحفظ کیا گیا ہے، تا کہ اشیائے صَرف اور اَشیائے ضرورت کی مصنوعی قلّت پیدا نہ کی جا سکے، اور ان کی قیمتیں من مانے اور مصنوعی طریقوں سے نہ بڑھائی جا سکیں۔

اِرتکازِ دولت کی بیخ کنی اور ''طلب و رسد'' کے تحفظ میں جو تفصیلات پیچھے آئی ہیں، ان سے ایک بات نمایاں طور پر یہ سامنے آتی ہے کہ اسلام کی معاشی تعلیمات میں تنخواہیں اور اُجرتیں بڑھانے سے زیادہ زور اس حکیمانہ اُصول پر دِیا گیا ہے کہ اشیائے ضرورت اور اَشیائے صَرف لوگوں کو آسانی اور فراوانی سے مناسب حد تک سستی مل سکیں، وہ ایک عام آدمی کی دسترس سے باہر نہ ہوں، رہیں تنخواہیں اور اُجرتیں تو ان کا تعین طلب و رسد کے قدرتی نظام کے تحت اور اَشیاء کی بازاری قیمتوں کو سامنے رکھ کر ہر شخص اپنے لئے خود کرتا

ہے، یعنی روزگار کے مواقع کی آزادی اور فراوانی کے باعث وہ یہ فیصلہ آزادانہ طور پر خود کرتا ہے کہ جتنے فرائض اور ذمہ داریاں اس نے اپنے ذمہ لی ہیں، اَشیائے صَرف کی قیمتوں کے پیشِ نظر، ان کا کتنا معاوضہ اس کے لئے کافی ہے؟ اس سے کم ملے تو یہ کوئی دُوسرا ذریعۂ معاش اِختیار کرلے گا، اور زیادہ مانگنے لگے تو کام لینے والا کسی اور کو تلاش کرلے گا۔ ہر شخص اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے دُوسرے کو اتنا دینے پر مجبور ہے جتنے کا وہ مستحق یا ضرورت مند ہے۔ اس کا نتیجہ یہ بھی نکلے گا کہ جب اشیائے صَرف کی قیمتیں مناسب حد تک کم ہوں گی تو اُجرتیں اور تنخواہیں بھی مناسب حد تک کم ہوجائیں گی۔ پیداواری لاگت کم ہوگی اور ایک متوازن معیشت وجود میں آئے گی۔

۷- اسلامی معیشت کی خصوصیات میں جگہ جگہ یہ بات سامنے آتی ہے، اور خصوصاً چھٹی خصوصیت نے اسے اور کھول دیا ہے کہ نظامِ سرمایہ داری کے برعکس اسلامی تعلیمات نے معیشت میں کسی بھی موقع پر، کسی بھی خاص طبقے کو نوازنے کے لئے کسی دُوسرے طبقے کو دبانے سے مکمل پرہیز کیا ہے، اور تمام بنی نوعِ انسان کے درمیان عدل وانصاف قائم رکھنے کا نہایت باریک بینی سے اِہتمام کیا ہے۔

۸- اسلام نے "غـــرَر" یعنی مُبہم اور غیر یقینی سودوں کی ممانعت کرکے جہاں بازار اور تجارت ومعیشت کو محفوظ اور فطری طور پر رواں دواں رکھنے کے لئے مالیاتی بحرانوں (Financial Crises) کا راستہ سختی سے روکا ہے، وہیں ایسے تمام راستوں پر پہرے بٹھادیئے ہیں جن سے تجارتی نزاعات پیدا ہوتے، اور باہمی دُشمنیاں جنم لیتی ہیں۔

آج کل نزاعات اور عداوتوں کا سیلاب، جہاں معاشرے کے امن وامان کو تباہ، اور معاشی سرگرمیوں کو قدم قدم پر مفلوج کررہا ہے، وہیں عدالتوں میں مقدمات کی بھرمار نے حق واِنصاف کا حصول اِنتہائی مشکل بنادیا ہے، ہر سطح کی عدالتوں کی تعداد جتنی بھی بڑھائی جاتی ہے، وہ مقدمات کی تیزی سے بڑھتی ہوئی رفتار کے سامنے ناکافی ہوجاتی ہے۔ اور اَب حالت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ لوگ برسوں تک وکیلوں اور عدالتوں کے چکر لگانے

کے بجائے اپنی مظلومیت ہی پر صبر کر بیٹھنے میں عافیت سمجھنے لگے ہیں۔

اگر اِسلامی معیشت کی مذکورہ بالا خصوصیات کو تعصّبات کے بجائے اِنصاف سے دیکھا جائے تو واضح ہوگا کہ یہ ایسی ممتاز خصوصیات ہیں جن سے تمام دُوسرے نظامہائے معیشت محروم چلے آرہے ہیں۔

اگر دُنیا کے لئے پھر معاشی توازن، بازاروں کی فطری آزادی، عدل وانصاف اور پُرسکون زندگی مقدّر میں ہے تو وہ صرف اسلام ہی کے دامنِ رحمت میں ملے گی۔

مُژدکی ہو کہ فرنگی ہَوَسِ خام میں ہے
امنِ عالم تو فقط دامنِ اسلام میں ہے

باب دوم

صنعتی تعلقات کے اسلامی اُصول

صنعتی تعلقات کے اسلامی اُصول

معاشی میدان میں ایک اہم دائرہ آجر یعنی مستأجر (Entrepreneur) اور اَجیر یعنی مزدور یا ملازم (Labour) کے تعلقات کا ہے، ہمارے زمانے میں صنعتی اِداروں کی کثرت اور وسعت کے باعث چونکہ مزدوروں کی اکثریت صنعت سے وابستہ ہے اس لئے ''آجر واَجیر'' کے تعلقات کو ''صنعتی تعلقات'' کہا جانے لگا ہے۔ اگرچہ یہ تعلقات صنعت وحرفت کے میدان میں ہوں، یا تجارت وزراعت میں یا زندگی کے دُوسرے میدانوں میں۔

بہرحال جو صورت بھی ہو ان تعلقات کے کسی ملک کی معیشت اور معاشرے پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں؟ ان تعلقات کی خوشگواری، گرم جوشی، پائیداری، اور نتیجہ خیزی ہی درحقیقت کسی ملک کی معاشی ترقی اور پُرامن فلاحی معاشرے کے قیام کے لئے، ٹھوس بنیاد فراہم کرتی ہے۔

غور کیا جائے تو واضح ہوگا کہ اسلامی معیشت کی جو بنیادی خصوصیات پیچھے بیان ہوئیں وہ آجر واَجیر کے صحت مند تعلقات کے لئے بھی ایسی بنیادی ضرورت ہیں جسے صرف تنخواہیں اور اُجرتیں بڑھا کر پورا نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ معاشی سرگرمیوں کو اگر عبادت کا سا تقدس حاصل نہ ہو، کام لینے والوں اور کام کرنے والوں کو آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کی فکر نہ ہو، وسائلِ معاش پر طاقتور طبقوں کی اِجارہ داریاں قائم رہیں، دولت کے دہانوں پر بھی وہی قابض ہوں، اور ''طلب ورسد'' (Demand and Supply) کی فطری قوتیں ان کے سامنے بے دست وپا ہوکر رہ جائیں، جس کا اذیت ناک

منظر آج دُنیا دیکھ رہی ہے، تو لوگوں کو اِنصاف نصیب ہو سکتا ہے نہ امیر وغریب کا تفاوت کم ہو سکتا ہے، آجر یعنی کام لینے والے کو دیانت دار و خیر خواہ کارکن نہ مل سکیں گے، اور اجیر یعنی کارکن اپنی محنت کا معقول صلہ نہ پا سکے گا۔ اگر مہنگائی کا ہمزاد بھی ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جائے تو تنخواہوں اور اُجرتوں کا اِضافہ بھی ایک بے معنی مذاق کے سوا کچھ نہیں رہتا، جس کا نتیجہ وہی ہوگا جو سامنے ہے کہ آجر واَجیر کے درمیان ختم نہ ہونے والی کشمکش طرح طرح کے معاشی اور معاشرتی مسائل کو جنم دیتی رہے گی۔

پھر یہ دائرۂ تعلقات چونکہ اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ معاشرے کی بھاری اکثریت اس سے وابستہ ہے، کیونکہ ہر وہ شخص جو اپنا کوئی ذریعۂ معاش رکھتا ہے یا اَجیر (مزدور و ملازم) ہوگا یا آجر، ایسے افراد بہت کم ملیں گے جنہیں اپنے ذریعۂ معاش کے لئے نہ کسی اجیر و ملازم کی ضرورت ہو نہ وہ خود کسی کے اَجیر یا ملازم ہوں، لہٰذا اِسلام نے جہاں ایک متوازن فلاحی معیشت کے قیام کے لئے وہ اُصول مقرر کئے ہیں جو پیچھے بیان کئے گئے وہیں آجر واَجیر کے باہمی تعلقات کے لئے خصوصی طور پر بھی نہایت اہم ہدایات دی ہیں۔ حدیث اور اِسلامی فقہ کی کتابوں میں ایک باب ''باب الاجارہ'' ہوتا ہے جس میں کرایہ داری، اور مزدوری و ملازمت کے شرعی اَحکام وآداب اور ان کے اُصول بیان کئے گئے ہیں۔ آگے اسی سلسلے کے قرآن وسنت اور اِسلامی فقہ میں بتائے گئے وہ بنیادی اُصول بیان کئے جائیں گے جن کے بغیر صنعتی تعلقات کا وہ پیچیدہ بگاڑ ختم نہیں ہو سکتا جس سے آج کی معیشت کو تقریباً ہر ملک میں سامنا ہے۔

(۱)

صنعت ومحنت کا احترام اور پیشوں کی عظمت

صنعتی تعلقات کے سلسلے میں سب سے پہلا اُصول جو قرآن وسنت کی روشنی میں سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ صنعت ومحنت کی قدردانی اور اس کی حوصلہ افزائی کو آجر وأجیر کے تعلقات میں بنیادی اہمیت حاصل ہے، اسلامی تعلیمات نے اس کو اتنا اُجاگر کیا ہے کہ کسی اور دِین ومذہب میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ عرب میں مختلف لوگ مختلف صنعتیں اِختیار کرتے تھے، کسی صنعت وحرفت کو حقیر یا ذلیل نہیں سمجھا جاتا تھا، اور پیشہ وصنعت کی بنیاد پر کسی شخص کو کم یا زیادہ نہ سمجھا جاتا تھا، نہ پیشوں کی بنیاد پر کوئی برادری بنتی تھی۔[۱] اس کے باوجود ہمارے موجودہ معاشرے میں یہ خرابی بُری طرح پھیل گئی ہے کہ مزدور اور مزدوری کو، اور بہت سے جائز اور حلال پیشوں کو حقیر سمجھا جانے لگا۔ درحقیقت یہ متکبرانہ بلکہ احمقانہ تصوّر بعض ہندو رسم ورِواج کا حصہ تھا۔ ان کے یہاں طبقات تھے، پیشوں کی بنیاد پر برادریاں بنتی تھیں، پیشوں کی بنیاد پر اُونچ نیچ تھی، جوتے گانٹھنے والے کو ''چمار'' اور بیت الخلاء صاف کرنے والے کو ''بھنگی'' کہتے تھے، اور ان پیشوں کو ایسا قابلِ نفرت سمجھا جاتا تھا کہ یہ الفاظ گالی کے طور پر اِستعمال ہونے لگے۔ ہندوؤں کے ساتھ رہنے سہنے سے ہندوستان کے مسلمانوں میں بھی اس خرابی نے رواج پالیا، اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۔

اسلام میں عزّت واِحترام کا مدار پیشوں پر نہیں بلکہ تقویٰ اور خداترسی پر ہے، جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی سے جتنا پرہیز کرنے والا ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ اتنا ہی باعزّت ہے اگرچہ وہ جوتے گانٹھتا، یا بیت الخلاء صاف کرتا ہو،

---

[۱] تفسیر معارف القرآن ج:۷ ص:۲۶۲ تفسیر سورۂ سبا۔

اسلامی معاشرے میں ہر وہ صنعت وحرفت اور ہر وہ پیشہ قابلِ احترام بلکہ باعثِ اجروثواب ہے جو حلال روزی کمانے کے لئے ہو۔ اور اگر اس میں خدمتِ خلق کی نیت بھی کرلی جائے کہ اس سے لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوں گی، تو اس کا ثواب مزید ملتا ہے۔

انسانی ضرورت کے علوم وفنون اور صنعت وحرفت بھی سنتِ انبیاء ہے

اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایسی اشیاء کی صنعت وحرفت، جو انسانی ضروریات سے متعلق ہوں کتنی اہم ہے؟ اس کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ انسانی ضرورت کی ساری اہم اور بنیادی صنعتیں اللہ تعالیٰ نے بذریعۂ وحی اپنے انبیاء کے ذریعے سکھلائی ہیں، پھر حسبِ ضرورت ان میں ترقی اور سہولتوں کا اضافہ مختلف زمانوں میں ہوتا رہا۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) پہیہ اور گاڑی کی ایجاد بذریعہ آدم علیہ السلام

سب سے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام کی طرف جو وحی آئی اُس کا بیشتر حصہ زمین کی آبادکاری اور مختلف صنعتوں سے متعلق تھا، بوجھ اُٹھانے کے لئے پہیوں کے ذریعے چلنے والی گاڑی بھی اسی سلسلے کی ایجادات میں سے ہے جو وحیٔ اِلٰہی کے ذریعے حضرت آدم علیہ السلام کے ہاتھوں عمل میں آئی۔[1] اس کے ذریعہ یہ بنیادی اور انقلابی تبدیلی لائی گئی کہ سیدھی حرکت (حرکتِ مستقیمہ) کو گھومنے والی حرکت (حرکتِ متدیرہ) میں تبدیل کردیا گیا۔

بانیٔ علیگڑھ سرسیّد صاحب نے صحیح کہا ہے کہ: زمانے نے طرح طرح کی گاڑیاں ایجاد کرلیں، لیکن مدارِ کار ہر قسم کی گاڑیوں کا ''دُھری'' اور پہیے پر ہی رہا، وہ بیل گاڑی اور گدھا گاڑی سے لے کر ریلوں اور بہترین قسم کی موٹر گاڑیوں تک سب میں مشترک ہے، اس لئے سب سے بڑا موجد گاڑیوں کا وہ شخص ہے جس نے پہیہ ایجاد کیا، کہ دُنیا بھر کی ساری

۱؎ تفسیر معارف القرآن ج:۴ ص:۶۲۰ تا ۶۲۱۔ و ج:۷ ص:۲۶۲۔

مشینری کی رُوح پہیہ ہی ہے۔[1]

(۲) جہاز بنانے کی صنعت نوح علیہ السلام کے ذریعے

حضرت نوح علیہ السلام کو، طوفانِ نوح سے بچنے کے لئے اور جس جس کو اس سے بچانا تھا، بچانے کے لئے، جب اللہ تعالیٰ نے کشتی بنانے کا حکم دیا تو اُس وقت وہ نہ کشتی کو جانتے تھے نہ اُس کے بنانے کو، اس لئے قرآنِ حکیم[2] میں ہے کہ ان کو ہدایت فرمائی کہ:

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا

یعنی: ''آپ کشتی بنائیں، ہماری نگرانی میں اور ہماری وحی کے مطابق۔''

روایاتِ حدیث میں ہے کہ جبرئیل امین نے بذریعہ وحیٔ اِلٰہی حضرت نوح علیہ السلام کو سفینہ سازی کی تمام ضروریات اور اُس کا طریقہ بتلایا۔ اُنہوں نے سال[3] کی لکڑی سے یہ کشتی تیار کی۔

بعض تاریخی روایات میں اس کی پیمائش یہ بتلائی گئی ہے کہ یہ تین سو (۳۰۰) گز لمبا، پچاس (۵۰) گز چوڑا، تیس (۳۰) گز اُونچا، تین (۳) منزلہ جہاز تھا، اور روشن دان مروّجہ طریقے کے مطابق دائیں بائیں کھلتے تھے، اس طرح یہ جہاز سازی کی صنعت وحیٔ خداوندی کے ذریعے سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کے ہاتھوں شروع ہوئی، پھر اس میں ترقیات ہوتی رہیں۔[4]

۱۔ حوالۂ بالا ص: ۶۲۱۔

۲۔ سورۂ ہود، آیت: ۳۷۔

۳۔ ''سال'' لکڑی کی ایک قسم کا نام ہے جو بہت پائیدار ہوتی ہے۔

۴۔ تفسیر معارف القرآن ج: ۴ ص: ۶۲۰۔

(۳) زِرہ سازی کی صنعت داؤد علیہ السلام کے ذریعے

حضرت داؤد علیہ السلام کو نبوّت ورِسالت کے ساتھ دُنیا کی سلطنت، حکومت بھی نہایت عظیم الشان عطا فرمائی گئی تھی جس کی امتیازی خصوصیات قرآنِ کریم کی سورۃ ''الانبیاء'' سورۃ ''سبا'' اور سورۃ ''صٓ'' میں بیان کی گئی ہیں۔

لوہے کی زِرہ جو جنگوں میں نیزوں، تیروں، تلواروں اور دیگر اسلحہ کی زَد سے بچنے کے لئے پہنی جاتی تھی، (اور آج بھی لوہے کی جیکٹیں آتشیں اسلحہ وغیرہ سے بچنے کے لئے پہنی جاتی ہیں) اس کی اصل صنعت حضرت داؤد علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی سکھائی تھی، قرآنِ کریم میں ارشاد[۱] ہے:

وَعَلَّمْنٰهُ صَنْعَةَ لَبُوْسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُمْ مِّنْۢ بَاْسِكُمْ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ شٰكِرُوْنَ ﴿۸۰﴾

''اور ہم نے اُنہیں (داؤد علیہ السلام کو) ایک جنگی لباس (یعنی زِرہ) بنانے کی صنعت سکھائی تاکہ وہ تمہیں لڑائی میں ایک دُوسرے کی زَد سے بچائے، اب بتاؤ کہ کیا تم شکر کرنے والے ہو؟''

اس آیت میں زِرہ سازی کی صنعت داؤد علیہ السلام کو سکھانے کی حکمت یہ بتلائی گئی ہے کہ یہ زِرہ تمہیں جنگ میں تلوار وغیرہ کی زَد سے محفوظ رکھ سکے۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جس سے اہلِ اِیمان اور اہلِ دُنیا سب کو کام پڑتا ہے، اس لئے اس صنعت کے سکھانے کو اللہ تعالیٰ نے اپنا ایک اِنعام قرار دِیا ہے، اور اس پر شکر ادا کرنے کی تلقین فرمائی ہے، معلوم ہے کہ جس صنعت کے ذریعے لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوں اس کا سیکھنا، سکھانا سنتِ انبیاء ہے، اور باعثِ اجروثواب ہے، بشرطیکہ نیت ثواب کی ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو صنعتکار اپنی صنعت میں نیت

---

[۱] سورۃ الانبیاء، آیت:۸۰

نیک یعنی (حلال کمانے اور) خدمتِ خلق کی رکھے اُس کی مثال موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کی سی ہو جاتی ہے کہ انہوں نے اپنے بچے کو دُودھ پلایا، اور معاوضہ فرعون کی طرف سے مفت میں ملا۔ اسی طرح خدمتِ خلق کی نیت سے صنعت کاری کرنے والوں کو اپنا مقصد (خدمتِ خلق اور حلال کمانے کا ثواب) تو حاصل ہوگا ہی، صنعت کا دُنیاوی فائدہ مزید ان کو ملے گا۔[1]

پھر سورۂ سبا میں اس زِرہ سازی کی یہ تفصیل بیان فرمائی گئی ہے کہ:

وَأَلَنَّا لَهُ الْحَدِيدَ ۝ أَنِ اعْمَلْ سَابِغَاتٍ وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا[2]

"ہم نے اُن (داوٗد علیہ السلام) کے لئے لوہے کو (موم کی طرح نرم کردیا، (اور یہ حکم دیا) کہ پوری پوری زِرہیں بناؤ، اور (ان کی) کڑیاں جوڑنے اور بُننے میں توازُن اور تناسب سے کام لو اور نیک عمل کرو۔"

ائمہ تفسیر نے فرمایا ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے لوہے کو بطور معجزے کے داوٗد علیہ السلام کے لئے موم کی طرح نرم کردیا تھا کہ اس سے زرہیں وغیرہ بنانے کے لئے نہ اُن کو آگ کی ضرورت پڑتی تھی اور نہ کسی ہتھوڑے یا دُوسرے آلات کی۔

اور اس آیت میں زِرہ کی کڑیاں جوڑنے اور بُننے میں توازُن اور تناسب رکھنے کی ہدایت بھی فرمائی گئی ہے کہ کڑیوں میں کوئی چھوٹی کوئی بڑی نہ ہو، تاکہ زِرہ مضبوط اور آرام دہ بھی بنے اور دیکھنے میں بھی بھلی معلوم ہو۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ صنعت میں ظاہری خوش نمائی کا لحاظ رکھنا بھی اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔[3]

---

[1] تفسیر معارف القرآن ج:۶ ص:۱۹۹ تا ۲۰۰۔

[2] سورۃ سبا، آیت: ۱۰ و ۱۱۔

[3] تفسیر معارف القرآن ج:۷ ص:۲۶۱۔

زِرہ سازی ہی داؤد علیہ السلام کا ذریعۂ معاش تھا، اس کا ایک سبق آموز واقعہ

تفسیر ابنِ کثیر میں ہے کہ: حضرت داؤد علیہ السلام اپنی خلافت وسلطنت کے زمانے میں بھیس بدل کر بازاروں وغیرہ میں جاتے، اور مختلف اَطراف سے آنے والے لوگوں سے پوچھا کرتے تھے کہ: داؤد کیسا آدمی ہے؟ تا کہ اگر کسی کو کوئی شکایت ہو تو اس کا اِزالہ کرسکیں۔ چونکہ ان کی سلطنت میں عدل وانصاف عام تھا، سب لوگ آرام وعیش کے ساتھ گزارہ کرتے تھے، کسی کو حکومت سے کوئی شکایت نہ تھی، اس لئے جس سے سوال کرتے وہ داؤد علیہ السلام کی تعریف وتحسین ہی کرتا تھا، اور عدل وانصاف پر اِظہارِ شکر کرتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے اُن کی تعلیم کے لئے اپنے ایک فرشتے کو اِنسانی شکل میں بھیج دیا، جب داؤد علیہ السلام اُس کام کے لئے نکلے تو یہ فرشتہ اُن سے ملا، حسبِ عادت اُس سے بھی وہی سوال کیا، فرشتے نے جواب دیا کہ داؤد سب لوگوں سے بہتر انسان ہے، اور اپنی اُمت اور رعیت کے لئے بھی بہترین ہے، مگر اس میں ایک عادت ایسی ہے کہ وہ نہ ہوتی تو وہ بالکل کامل ہوتا۔ داؤد علیہ السلام نے پوچھا وہ کیا عادت ہے؟ فرشتے نے کہا کہ وہ اپنا کھانا پینا اور اپنے اہل وعیال کا گزارہ مسلمانوں کے مال یعنی سرکاری خزانے سے لیتے ہیں۔

یہ سن کر حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے اِلحاح وزاری سے دُعا کی کہ آپ مجھے کوئی ایسا کام سکھادیں جو میں اپنے ہاتھ سے پورا کروں، اس کی اُجرت سے اپنا اور اپنے اہل وعیال کا گزارہ کروں، اور مسلمانوں کی خدمت اور حکومت وسلطنت کے تمام کام بلا معاوضہ انجام دُوں۔ یہ دُعا اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی، اُن کو زِرہ سازی کی صنعت سکھادی، اور پیغمبرانہ اِعزاز، یہ دیا کہ لوہے کو اُن کے لئے موم کی طرح نرم کردیا تا کہ بہت تھوڑے وقت میں آسانی سے اپنا گزارہ پیدا کر کے باقی وقت عبادت اور اُمورِ سلطنت میں لگاسکیں۔

اس سلسلے کا ایک شرعی مسئلہ

حاکمِ وقت کو جو اپنا پورا وقت سرکاری کاموں کی انجام دہی میں خرچ کرتا ہے، شرعاً یہ جائز ہے کہ وہ اپنا اور اپنے اہل وعیال کا متوسط درجے کا گزارہ سرکاری خزانے سے لے لیا کرے، لیکن سرکاری فرائض میں ادنیٰ خلل ڈالے بغیر اگر کوئی دُوسری صورت گزارے کی ہو سکے تو وہ زیادہ پسندیدہ ہے۔ حضرت داوٗد علیہ السلام نے اسی بہتر صورت کو اِختیار فرمایا، اور اسی پر قناعت کی۔

علمائے دِین جو تعلیم وتبلیغ کی خدمت انجام دیتے ہوں، اور قاضی ومفتی جو لوگوں کے کام میں اپنا وقت لگاتے ہوں، اُن کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ اپنی ان خدمات کا معاوضہ لے سکتے ہیں، مگر کوئی دُوسری صورت گزارہ کی ہو جو دِینی خدمت میں خلل انداز بھی نہ ہو تو وہ بہتر ہے۔[1]

(۴) فنِ کتابت - آدم واِدریس (علیہما السلام) کے ذریعے

مشہور صحابی حضرت ابنِ عباس (رضی اللہ عنہما) کی طرف یہ روایت منسوب ہے کہ: ”حضرت آدم علیہ السلام کے بعد سب سے پہلے حضرت اِدریس علیہ السلام نے کتابت کی، اور عربی کتابت کے موجد اسماعیل علیہ السلام ہیں[2]۔“

اور ایک روایت میں ہے کہ:

---

[1] زِرہ سازی سے متعلق یہ مضمون تفسیر معارف القرآن سے اِختصار وتشریح کے ساتھ ماخوذ ہے۔ حوالوں کی تفصیل پیچھے آچکی ہے۔

[2] دیکھئے: کتابتِ حدیث عہدِ رسالت وعہدِ صحابہ میں ص:۴۰، بحوالہ "العقد الفريد" لابن عبد ربه، وكتاب التوقيعات ج:۳ ص:۳۔

''حضرت اِدریس علیہ السلام پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم کو اِستعمال کیا۔''[1]

(۵) علمِ فلکیات وریاضی کی اِبتداء اِدریس علیہ السلام کے ذریعے

حضرت اِدریس علیہ السلام ہی پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے علمِ فلکیات کی اِبتداء کی، ان کو اللہ تعالیٰ نے اَفلاک اور ان کی ترکیب، ستاروں کے اِجتماع واِفتراق کے نقاط، اور ان کے درمیان کشش کے رُموز واَسرار کی تعلیم دی، اور ان کو علمِ عدد وحساب کا عالم بنایا تھا۔[2]

تاریخ الحکماء میں تو یہ دعویٰ بھی نقل کیا گیا ہے کہ طوفانِ نوح سے پہلے دُنیا میں جس قدر علوم رائج ہوئے اُن سب کے معلّمِ اوّل اِدریس علیہ السلام ہی ہیں، علمِ طب کی ایجاد، اور زمینی وآسمانی اشیاء کے متعلق موزون قصائد کے ذریعے اِظہارِ خیال بھی ان ہی کی اَوّلیات میں سے ہیں۔[3]

اِن کا زمانہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان ہے، اور یہ حضرت نوح علیہ السلام کے آباء واجداد میں سے ہیں۔[4]

(۶) عہدِ رِسالت میں صنعت سیکھنے کا اِہتمام

عہدِ رِسالت میں بھی صنعت سیکھنے کا اِہتمام کیا گیا، جس کی ایک مثال یہ ہے کہ دو مشہور صحابی، حضرت عروۃ بن مسعود اور غیلان بن سلمۃ (رضی اللہ عنہما) نے اہم جنگی

---

[1] تفسیر بغوی (معالم التنزیل) تحت آیۃ "وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِدْرِيسَ" ج:۵ ص:۲۳۷۔ وقصص القرآن ج:۱ ص:۹۰، بحوالہ صحیح ابنِ حبان۔

[2] قصص القرآن ج:۱ ص:۹۶، بحوالہ "تاریخ الحکماء" للعلّامۃ جمال الدین القطفیؒ۔

[3] قصص القرآن ج:۱ ص:۱۰۰۔

[4] قصص القرآن ج:۱ ص:۸۹۔

سازوسامان کی صنعت سیکھنے کے لئے جُرَش کا سفر کیا، اور وہاں جا کر دَبّابَہ، مِنْجَنِیق اور ضُبُـــور بنانے کی تربیت حاصل کی، اُسی زمانے میں غزوۂ حنین ہوا، اسی لئے وہ غزوۂ حنین اور طائف کے محاصرے میں شریک نہ ہوسکے۔[1]

دَبّـابَـہ ایک قسم کی جنگی گاڑی تھی، جس سے وہی کام لیا جاتا تھا جو آج کل ٹینک سے لیا جاتا ہے، چنانچہ آج کل بھی ٹینک کو عربی میں "دَبّـابة" ہی کہا جاتا ہے۔ مِـنْـجَـنِیق سے وہ کام لیا جاتا تھا جو آج کل توپ سے لیا جاتا ہے، اور ضُبُـــوْر لکڑی کا ایک بڑا آلہ تھا جس پر چمڑا چڑھا دیا جاتا تھا، پھر اُس کی آڑ میں دُشمن کے قلعے کے پاس پہنچ کر حملہ کرتے تھے، اس کا اِستعمال بھی دبّابہ کے مشابہ تھا۔[2]

زراعت و باغبانی بھی سنتِ انبیاء ہے

باغبانی اور زراعت کا ثواب کتنا دُوررَس ہے اس کا اندازہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اِرشاد سے لگایئے کہ:

(۱) ما من مسلم يغرس غرسًا إلّا كان ما أكل منه له صدقة، وما سرق منه له صدقة، وما أكل السبع فهو له صدقة، وما أكل الطير فهو له صدقة، ولا يرزؤه أحد إلّا كان له صدقة۔[3]

"جو مسلمان بھی کوئی پودا لگاتا ہے اس سے جو کچھ کھایا جائے وہ اس کی طرف سے صدقہ ہوجاتا ہے، اور اس میں سے جو کچھ چوری ہوجائے وہ بھی اس کی طرف سے صدقہ بن جاتا ہے، اور اس سے جو کچھ کوئی درندہ کھالے وہ بھی اس کی طرف سے صدقہ بن جاتا ہے،

---

[1] تاریخ الامم والملوك للطبری ج:۲ ص:۳۵۳۔ والبداية والنهاية ج:۳ ص:۵۵۳ (غزوة الطائف)۔

[2] المنجد۔

[3] صحيح مسلم، ج:۲ ص:۱۵، كتاب المساقاة، باب فضل الغرس والزرع۔

اور اس سے جو کوئی پرندہ کھالے وہ بھی اس کی طرف سے صدقہ بن جاتا ہے، اور کوئی بھی اس میں سے جو کچھ بھی لے لے وہ اس کی طرف سے صدقہ بن جاتا ہے۔"

(۲) ایک اور روایت میں زراعت کی بھی یہی فضیلت ارشاد فرمائی ہے، اُس میں الفاظ یہ ہیں کہ:

"لا يغرس مسلم غرسًا ولا يزرع زرعًا فيأكل منه إنسان ولا دابّة ولا شيء إلّا كانت له صدقة۔"[۱]

"جو مسلمان کوئی پودا لگاتا ہے یا کھیتی کرتا ہے پھر کوئی انسان یا کوئی جانور اس میں سے جو کچھ کھائے وہ اس مسلمان کی طرف سے صدقہ ہو جاتا ہے۔"

(۳) درخت اُگانے کی تاکید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا ہے کہ:

"إن قامت الساعةُ وفي يد أحدكم فسيلةٌ، فإن استطاعَ أن لا تقوم حتّٰى يغرسها فليغرسها۔"

یعنی "اگر قیامت اس حالت میں آجائے کہ کسی کے ہاتھ میں (درخت کا) کوئی پودا ہو، تو اگر وہ (بفرضِ محال) قیامت (مکمل) ہونے سے پہلے اُس پودے کو بو سکے تو اُسے بو دے۔"[۲]

---

[۱] صحیح مسلم ج:۲ ص:۱۵، کتاب المساقاۃ، باب فضل الغرس والزرع۔ اسی کے ہم معنی روایت صحیح بخاری میں بھی ہے (دیکھئے صحیح بخاری مع فتح الباری، کتاب الحرث والمزارعۃ، حدیث نمبر ۲۳۲۰، ج:۵ ص:۳)۔

[۲] الأحاديث المختارة، لضياء الدين المقدسیؒ، حدیث نمبر ۲۷۱۱ تا نمبر ۲۷۱۵، ج:۷ ص:۲۶۲۔ ومسند احمد، حدیث نمبر ۱۲۹۰۲ ونمبر ۱۲۹۸۱، ج:۲۰ ص:۲۵۱ وص:۲۹۶، قال محققه الشيخ شعيب الأرنؤوط: "اسنادُه صحيح على شرط مسلم"۔ ومسند عبد بن حُميد نمبر ۱۲۱۶، ص:۳۶۶۔ وكشف الاستار للهيثمي (زوائد البزار) حدیث نمبر ۱۲۵۱، ج:۲ ص:۸۱۔

چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت آدم، حضرتِ اِبراہیم اور حضرتِ لوط علیہم السلام بھی زراعت (کاشت کاری) فرماتے تھے۔[1]

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور واقعہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلمانِ فارسی رضی اللہ عنہ کی مدد کے لئے مدینہ منورہ کے ایک باغ میں کھجور کے تین سو (۳۰۰) درخت اپنے دستِ مبارک سے لگائے تھے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے ایک سال گزرنے نہ پایا تھا کہ اُن سب پر پھل آ گیا۔[2] یہ باغ آج بھی موجود ہے، لوگ اُس کی زیارت کو جاتے ہیں۔

تجارت بھی سنتِ انبیاء ہے

اسلامی تعلیمات کی رُو سے تجارت بھی بہت معزز پیشہ ہے، اس کے شرعی اَحکام وفضائل قرآن وسنت میں بڑی اہمیت کے ساتھ آئے ہیں، کچھ مثالیں یہ ہیں:

(۱) دیانت دار تاجروں کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ بشارت پیچھے بابِ اوّل میں خصوصیت نمبر ۳ کے تحت آ چکی ہے کہ:

"التَّاجِرُ الصَّدُوْقُ الاَمِین مع النَّبِیِّیْنَ والصِّدِّیقین والشُّھداء"

یعنی: "سچا امانت دار تاجر (آخرت میں) انبیائے کرام اور صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔"[3]

---

[1] دیکھئے علامہ سیوطیؒ کی "الدر المنثور" ج:۱ ص:۸۸۔

[2] سیرۃ المصطفیٰ ج:۱ ص:۴۲۴۔

[3] رواہُ الترمذی عن ابی سعید الخدری رضی اللہ عنہ، وقال: "ھٰذا حدیث حسن" حدیث نمبر: ۱۲۰۹، ج:۲ ص:۴۹۸، باب ماجاء فی التُّجّار، ابواب البیوع۔ رواہُ الدارمی، حدیث نمبر: ۲۵۳۹، باب التاجر الصدوق، کتاب البیوع۔ والدارقطنی فی سننہ، حدیث نمبر: ۱۸، ج:۳ ص:۷۔ وعبد بن حُمید فی مسندہ، حدیث نمبر: ۹۲۶، ج:۱ ص:۲۹۹۔

وہیں اس کی ضروری تشریح بھی آگئی ہے۔

(۲) اور بد دیانت تاجروں کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ ہولناک وعید بھی وہاں آچکی ہے کہ:

"إنَّ التُّجَّارَ يُبعَثُون يومَ القيامة فُجّارًا، إلّا من اتّقٰى وَبرَّ وصَدقَ۔"

یعنی: "تاجروں کا حشر قیامت کے دن نافرمانوں والا ہوگا، سوائے اُن کے جنہوں نے (تجارت میں) تقویٰ اِختیار کیا، اور قسم پوری کی، اور سچ بولا۔"[۱]

آزاد بین الاقوامی تجارت کو بھی اللہ نے نعمت قرار دیا ہے

(۳) قرآنِ حکیم میں سورۃ القریش (لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ) کا تجارت سے بلکہ بین الاقوامی تجارت سے خاص تعلق ہے، پس منظر اس کا یہ ہے کہ سرزمینِ مکہ میں زراعت وباغبانی کے اسباب وذرائع نہیں ہیں، لہٰذا یہاں لوگوں کا گزارہ کچھ تو گلہ بانی، یعنی بھیڑ بکریاں پالنے، اور ان کو چَرانے پر تھا، اور بیشتر ذریعۂ معاش تجارت تھا، ان کے تجارتی قافلے سردیوں اور گرمیوں کے موسموں میں، شام، فلسطین، یمن، مصر، عراق، حبشہ (ایتھوپیا) وغیرہ جایا کرتے تھے۔[۲]

قبیلۂ قریش کے لوگ چونکہ کعبہ شریف کے خادم ونگہبان تھے اس لئے پورے جزیرہ نمائے عرب میں ان کا خاص اِحترام تھا، دُوسرے قبائل کو رہزنوں اور دُشمنوں سے

---

[۱] رواهُ الترمذی، وقال: "هٰذا حديث حسن صحيح"، وابن ماجة، والدارمي، والبيهقي۔ وقال الذهبي في تلخيص المستدرك: "صحيح"۔ ان حوالوں کی مزید تفصیل پیچھے بابِ اوّل میں تیسری خصوصیت کے تحت دیکھی جاسکتی ہے۔

[۲] دیکھئے کتاب "رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی" تصنیف ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ ص:۳۱ تا ۳۲ (طبع دارالاشاعت کراچی)۔

بچتے ہوئے سفر کرنا سخت مشکل تھا، جبکہ قریش کے تجارتی قافلے مأمون ومحفوظ تھے، اس امن اور حفاظت کی ایک بڑی وجہ اصحابِ فیل کا وہ عبرت ناک واقعہ بھی تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے صرف پچاس یا پچپن روز پہلے رُونما ہوا تھا[1]، کہ یمن کا حاکم (گورنر) اَبْرَھَۃْ - جو مذہباً عیسائی تھا - بیت اللہ شریف کو ڈھانے کے لئے جب مکہ مکرمہ کے قریب آ پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے اُسے اور اس کے ہاتھیوں اور ساتھیوں کو پرندوں کے ایک غول کے ذریعے ہلاک اور تہس نہس کر ڈالا، اس کا خوفناک حال قرآنِ حکیم نے سورۃ الفیل میں بہت پُر اثر معجزانہ انداز میں بیان کیا ہے۔

اس عجیب وغریب واقعے سے ایک طرف تو اہلِ یمن اور آس پاس کے دُوسرے قبائل میں کعبۃ اللہ کی عظمت وجلالت کا عقیدہ مزید مستحکم ہو گیا، دُوسری طرف خود قبیلۂ قریش - جو بیت اللہ کا خادم ونگہبان تھا - اُس کا رُعب اور دبدبہ مزید قائم ہو گیا، اور ان کے تجارتی قافلوں کی راہ اور زیادہ ہموار ہو گئی، جو اُن کی معاشی خوش حالی کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔

چنانچہ قرآنِ کریم میں سورۃ الفیل کے متصل بعد ہی سورۃ "لِاِیْلٰفِ قُرَیْشٍ" ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے مکہ والوں یعنی قبیلۂ قریش پر اِسی اِحسان وانعام کا ذِکر فرمایا ہے، اور ان سے مطالبہ کیا ہے کہ جس بیت اللہ کی بدولت تم کو یہ عزّت اور خوش حالی نصیب ہوئی اُس کے رَبّ ہی کی عبادت کرو۔ اِرشاد ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ ﴿١﴾ اٖلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ﴿٢﴾ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ﴿٣﴾ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ۙ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ﴿٤﴾

ترجمہ:- "چونکہ قریش کے لوگ عادی ہیں، یعنی وہ سردی اور گرمی کے موسموں میں (تجارت کے لئے یمن اور شام وفلسطین وغیرہ) کے سفر کرنے کے عادی ہیں، اس لئے ان کو چاہئے کہ وہ اس گھر کے

[1] سیرۃ المصطفیٰ ج:۱ ص:۵۱۔

مالک کی عبادت کریں، جس نے بھوک میں انہیں کھانے کو دیا، اور
بدامنی سے اُنہیں محفوظ رکھا۔"

یہ آزاد بین الاقوامی تجارت جو قریشِ مکہ کو نصیب ہوئی اللہ تعالیٰ نے اسے اپنا انعام قرار دیا ہے، اور اس کے شکرانے کے طور پر اُن سے اپنی ہی عبادت کا مطالبہ فرمایا ہے، جس سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ اسلامی تعلیمات کی رُو سے بین الاقوامی تجارت کا بھی آزاد ہونا مطلوب اور قابلِ ستائش ہے جس کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے۔

آج کیپٹلزم (نظامِ سرمایہ داری) میں آزاد تجارت کا بہت چرچا ہے، اور سوشلزم کے مقابلے میں کیپٹلزم کو آزاد تجارت کا نظام کہا بھی جاتا ہے، لیکن بازار کی حقیقی آزادی اس نظام میں بھی نہیں، جس کی کچھ تفصیل اس کتاب کے بابِ اوّل میں پانچویں خصوصیت کے تحت آچکی ہے۔ اس نظامِ سرمایہ داری میں بین الاقوامی امپورٹ ایکسپورٹ پر بہت پابندیاں لگی ہوئی ہیں، جن سے تاجروں کو بھی جگہ جگہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور تجارتی عمل کی روانی میں قدم قدم پر رُکاوٹیں پیش آتی ہیں، پھر لائسنس، پرمٹ اور کسٹم ڈیوٹی وغیرہ کے نام سے جتنی فیسیں اور ٹیکس تاجروں سے وصول کئے جاتے ہیں، ان کی زد بھی بالآخر عوام ہی پر پڑتی ہے کیونکہ تاجر، اِن اشیاء کی قیمتیں بڑھا کر وہ ساری رقم صارفین سے وصول کر لیتے ہیں، جبکہ اسلامی تعلیمات کی اصل رُوح یہ ہے کہ تجارت کو اِنسانوں کی لگائی ہوئی ایسی پابندیوں سے آزاد ہونا چاہئے۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد اس سلسلے میں سونے سے لکھنے کے قابل ہے کہ:

"اُوصِیکُمْ بالتُّجَّارِ خیرًا، فانّهم بُرُدُ الآفاق واُمناءُ الله فی الارض۔"

یعنی: "میں تمہیں تاجروں کے ساتھ اچھے برتاؤ کی وصیت کرتا ہوں

کیونکہ یہ دُنیا کے اطراف تک (لوگوں کی ضرورت) پہنچانے والے
ہیں، اور زمین میں اللہ تعالیٰ کے امین ہیں۔"[۱]

پیشۂ تجارت کا سب سے بڑا اِعزاز

(۴) پیشۂ تجارت کا سب سے بڑا اِعزاز یہ ہے کہ سیّد الاوّلین والآخرین، خاتم النّبیین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس میں حصہ لیا ہے۔ کبھی مشارکت کے طور پر، کبھی مضاربت کے طور پر، چنانچہ عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں زمانۂ جاہلیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شریکِ تجارت تھا، جب مدینہ منورہ حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا: مجھ کو پہچانتے بھی ہو؟ میں نے عرض کیا:

"کیوں نہیں، آپ تو میرے شریکِ تجارت تھے، اور کیسے اچھے
شریک تھے کہ نہ کسی بات کو ٹالتے تھے، اور نہ کسی بات میں جھگڑتے
تھے۔"[۲]

نیز قیس بن سائب مخزومی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ:

"زمانۂ جاہلیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میرے شریکِ
تجارت تھے، نہ جھگڑتے تھے اور نہ کسی قسم کا مناقشہ کرتے تھے۔"[۳]

اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا عرب کے شریف خاندان کی بڑی مال دار خاتون تھیں، قریش جب اپنا قافلہ تجارت کے لئے روانہ کرتے تو حضرت خدیجہ بھی اپنا مال کسی کو بہ طور مضاربت دے کر روانہ کرتیں، (مضاربت کا مطلب یہ ہے کہ مال ایک کا ہو، عمل دُوسرے کا، اور نفع میں دونوں شریک ہوں) جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف پچیّس (۲۵) سال ہوئی، اور گھر گھر آپ کی امانت و دیانت کا چرچا ہوا تو حضرت

۱۔ فضائلِ تجارت ص:۶۵، بحوالہ "التراتیب الإداریة" ج:۲ ص:۲۰ عن الدیلمی۔
۲۔ سیرۃ المصطفیٰ ج:۱ ص:۹۶ بحوالہ الإصابة۔
۳۔ سیرۃ المصطفیٰ ج:۱ ص:۹۶ بحوالہ الإصابة۔

خدیجہؓ نے آپ کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر آپ میرا مال، تجارت کے لئے شام لے جائیں تو آپ کو (نفع میں حصہ) دُوسروں کی بہ نسبت زیادہ دُوں گی۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا ابوطالب کی مالی مشکلات کی وجہ سے اس پیغام کو قبول فرمالیا، اور حضرت خدیجہ کے غلام "مَیسَرۃ" کو ساتھ لے کر شام روانہ ہوگئے، (شام کا یہ سفر طرح طرح کے ایمان افروز واقعات پر مشتمل ہے، سیرتِ طیبہ میں اس کی عجیب وغریب تفصیلات آئی ہیں، یہاں ان میں سے صرف زیرِ بحث موضوع سے متعلق حصہ نقل کیا جارہا ہے)۔

آپ نے شام سے واپس آکر مالِ تجارت حضرتِ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سپرد کیا، اس مرتبہ آپ کی برکت سے حضرت خدیجہ کو اتنا زیادہ نفع ہوا کہ پہلے کبھی اتنا نہ ہوا تھا، حضرت خدیجہ نے نفع کا جتنا حصہ آپ سے مقرّر کیا تھا، اس سے زیادہ دیا۔[۱]

بعض تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سفرِ شام سے پہلے بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سرزمینِ عرب کے بعض علاقوں میں تجارت کے لئے حضرت خدیجہ کا سامان لے کر گئے تھے۔[۲]

اس سفر سے واپسی کے ۲ ماہ اور ۲۵ روز کے بعد خود حضرت خدیجہؓ نے آپ سے نکاح کا پیغام دیا، آپ نے اپنے چچا کے مشورے سے قبول فرمالیا۔ نکاح کے وقت آپ کی عمر شریف ۲۵ سال اور حضرت خدیجہ کی عمر شریف چالیس (۴۰) سال تھی۔[۳]

۵- حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبی حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام بھی تاجر تھے۔[۴]

۶- صحابہ کرام کی ایک بڑی تعداد پیشۂ تجارت سے وابستہ تھی، جن میں حضرت

---

[۱] سیرۃ المصطفیٰ ج:۱ ص:۹۹ تا ص:۱۰۱۔

[۲] رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیاسی زندگی، از ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ص:۴۹۔

[۳] سیرۃ المصطفیٰ ج:۱ ص:۱۱۱ تا ۱۱۲۔

[۴] تفسیر الدرّ المنثور للسیوطیؒ ج:۱ ص:۸۸۔

ابوبکر صدیق، حضرت فاروقِ اعظم، حضرت عثمانِ غنی، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت زبیر (رضی اللہ عنہم) خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، یاد رہے کہ یہ پانچوں حضرات صحابۂ کرامؓ کی اُس مقدس جماعت میں سے ہیں جن کو ''عشرۂ مبشرہ'' کہا جاتا ہے، یعنی وہ دس صحابۂ کرام جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نام بنام جنت کی بشارت دی ہے۔

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی ایک مختصر مگر بہت مفید تصنیف ''فضائلِ تجارت'' میں مزید کئی صحابہ کرام کا ذِکر بطور تاجر کے کیا ہے، اور ان کے مختصر مختصر واقعات بھی تجارت سے متعلق بیان کر کے لکھا ہے کہ:

''صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم مختلف چیزوں کی تجارت کرتے تھے، جس کی تفصیل (کتاب) "التراتیب الإداریۃ" میں ہے، اس میں مختلف ابواب کے تحت صحابہ کی مختلف انواعِ تجارت کا ذِکر کیا ہے۔''[1]

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تجارت معروف تھی، مکی زندگی میں بھی یہی ذریعۂ معاش تھا، مدنی زندگی میں بھی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب آپ خلیفہ بنادیئے گئے، اور اِسلامی حکومت کی باگ ڈور اور ذمہ داری آپ کے سپرد ہوئی تو اگلے ہی دن صبح کو تجارت کی غرض سے سر پر کپڑے اُٹھائے ہوئے بازار کی طرف نکلے، حضرت عمر اور حضرت ابوعبیدۃ بن الجراح (رضی اللہ عنہما) سے ملاقات ہوگئی، انہوں نے کہا: یہ کام کیسے کرو گے جبکہ مسلمانوں کی حکومت کی ذمہ داری آپ پر آگئی ہے؟

فرمایا: ''پھر میں اپنے اہل وعیال کو کہاں سے کھلاؤں گا؟''

انہوں نے عرض کیا: ہم آپ کے لئے وظیفہ (الاؤنس، اعزازیہ) مقرر کردیں گے، چنانچہ صحابہ کرام نے متفقہ طور پر ان کے لئے یومیہ ایک بکری کی قیمت کا نصف حصہ مقرر کردیا۔[2]

---

[1] "فضائلِ تجارت ص:۶۷ تا ۷۱، بحوالہ "التراتیب الإداریۃ" ج:۲ ص:۱۰ تا ۳۲۔

[2] فتح الباری ج:۴ ص:۳۰۵، کتاب البیوع، باب کسب الرجل وعملہ بیدہ۔

یہ واقعہ ذکر کر کے حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے شارح بخاری ابن زکری کا قول نقل کیا ہے کہ:

''ہر وہ شخص جو مسلمانوں کے کاموں میں مشغول ہو، مثلاً قاضی، مفتی، مدرّس، ان کا بھی یہی معاملہ ہونا چاہئے۔''[1]

حضرت عمر فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جو بعض احادیث بروقت نہ معلوم ہو سکیں ان کے بارے میں انہوں نے خود فرمایا کہ:

"اَلْهَانِی الصَّفْقُ بِالْاَسْوَاق"[2]

یعنی: ''مجھے بازار کے کاروبار نے مشغول رکھا (جس کی وجہ سے بعض حدیثیں معلوم نہ ہو سکیں۔'')

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے زمانۂ خلافت میں ایک مرتبہ بازار تشریف لے گئے تو دیکھا کہ عموماً تجارت کرنے والے باہر سے آئے ہوئے عام لوگ ہیں، یہ دیکھ کر غمگین ہوئے اور جب خاص خاص لوگ جمع ہوئے تو ان سے یہ بات ذکر فرمائی، لوگوں نے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فتوحات اور مالِ غنیمت کی وجہ سے ہم کو تجارت سے مستغنی کر دیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا:

''اگر تم لوگ ایسا کرو گے (تجارت چھوڑ دو گے) تو تمہارے مَردان (کافر) مَردوں کے محتاج ہو جائیں گے اور تمہاری عورتیں اُن کی عورتوں کی محتاج ہو جائیں گی۔''

---

[1] فضائلِ تجارت ص:۶۷۔ ناچیز رفیع عثمانی عرض کرتا ہے کہ سرکاری خدمات انجام دینے والے حکام اور افسروں کا بھی یہی حکم ہے، اس کی دلیل بھی یہی واقعہ ہے۔

[2] صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب الخروج فی التجارۃ، حدیث نمبر ۱۹۲۰۔ وصحیح مسلم، کتاب الآداب، باب الإستئذان، حدیث نمبر: ۴۰۰۹۔

علامہ عبدالحی کتانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

"حضرت عمر کی فراست اس اُمت کے بارے میں بالکل سچی ثابت ہوئی، جب اُمت نے شرعی طریقے سے تجارت کو چھوڑ دیا تو اس کو غیروں نے اِختیار کرلیا، اور اُمتِ مسلمہ غیروں کی محتاج ہوگئی۔"[۱]

حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ کا تاجر ہونا تو بہت مشہور ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی تجارت میں ایسی برکت اور مال داری عطا فرمائی تھی کہ ان کے نام کے ساتھ لفظ "غنی" استعمال ہونے لگا، جب بھی مسلمانوں کو، یا اِسلامی حکومت کو کوئی اہم مالی ضرورت پیش آئی اُس کو اپنے مال سے پورا کرنے کی کوشش میں پیش پیش رہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم نے جب غزوۂ تبوک کے لئے چندہ کیا تو حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ عنہ نے تین سو (۳۰۰) اُونٹ پورے ساز وسامان کے ساتھ پیش کئے۔[۲]

ایک دُوسری روایت میں ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر ایک ہزار دِینار (اشرفی) کا عطیہ پیش کیا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دِیناروں کو اپنی گود میں اُلٹتے پلٹتے ہوئے فرمایا: "آج کے بعد عثمان کو کوئی عمل نقصان نہیں پہنچائے گا" دو مرتبہ ایسا ہی فرمایا۔[۳]

محنت اور ملازمت ومزدوری بھی سنتِ انبیاء ہے

اس کی بھی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) بڑھئی (کارپینٹر) کا پیشہ:

۱۔ فضائلِ تجارت ص:۶۶، بحوالہ "التراتیب الإداریۃ" ج:۲ ص:۲۱۔

۲۔ فضائلِ تجارت ص:۶۸، بحوالہ مشکوٰۃ شریف۔

۳۔ فضائلِ تجارت ص:۶۸۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد[1] ہے:

"کان زکریّا نجّارًا"

یعنی: ''زکریا علیہ السلام بڑھئی (کارپینٹر) کا کام کرتے تھے۔''

اور یہی اُن کا ذریعۂ معاش تھا۔[2]

(۲) درزی (ٹیلر) کا پیشہ:

مشہور کتبِ تفسیر میں حضرت ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کا یہ بیان نقل کیا گیا ہے کہ[3]:

"إن إدريس كان خيّاطًا"

یعنی: ''اِدریس علیہ السلام کا پیشہ کپڑوں کی سلائی (درزی کا کام) تھا۔''

بعض تاریخی روایات میں ہے کہ حضرت ہود علیہ السلام اور لقمان حکیم کا ذریعۂ معاش بھی یہی تھا۔[4]

(۳) گلہ بانی، بکریاں چرانا:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ[5]: تمام انبیاء (علیہم السلام) نے بکریاں چرائی ہیں (گلہ بانی کی ہے)، صحابہ کرام نے پوچھا: کیا آپ نے بھی؟ تو آپ نے فرمایا:

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، بابٌ من فضائل زکریّا صلی اللہ علیہ وسلم، حدیث نمبر ۲۳۸۰، عن ابی ہریرۃؓ۔ وسنن ابن ماجۃ، ابواب التجارات، باب الصناعات ص:۱۵۶، ومسند احمد ج:۱ ص:۱۱۳۔

[2] شرح مسلم للنوویؒ تحت هٰذا الحديث المرفوع۔

[3] تفسیر ابن کثیر، سورۃ مریم آیت:۵۶ "وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ" ج:۵ ص:۲۴۱۔ وتفسير الدر المنثور للعلّامة السيوطيؒ ج:۱ ص:۸۸۔

[4] محاضرات الأدباء ج:۱ ص:۲۱۰، وعن سعید بن المسیّب: "كان لقمان الحكيم خيّاطًا" ربيع الأبرار ج:۱ ص:۲۲۷۔

[5] صحیح بخاری، کتاب الإجارۃ، باب رعی الغنم علی قراریط، حدیث نمبر:۲۲۶۲، ج:۴ ص:۱۴۱۔

"نعم، كنتُ اَرعاها على قراريط لأهلِ مكة"

''ہاں، میں (نوجوانی کے زمانے میں) اہلِ مکہ کی بکریاں کچھ قیراطوں کے عوض میں چرایا کرتا تھا۔''

دِینار یا دِرہم کے ایک مقرّرہ حصے کو'' قیراط'' کہا جاتا ہے۔[1]

محنت کی عظمت

(۱) آپ نے مسجدِ نبوی کی تعمیر میں پتھر بھی ڈھوئے[2]، اور غزوۂ خندق کے موقع پر خندق کی کھدائی اور مٹی ڈھونے میں پیش پیش رہے۔[3]

(۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ: آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے جوتے خود گانٹھ لیتے اور اپنے کپڑے سی لیتے تھے، اور اپنے گھریلو کام بھی کرتے تھے۔[4]

(۳) نیز فرماتی ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کپڑے خود صاف کر لیتے تھے اور اپنی بکری کا دُودھ خود دوہ لیتے تھے، اور اپنے کام خود کرتے تھے۔[5]

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اِرشاد حلال کمائی کی خاطر کسی بھی قسم کی محنت کرنے والوں کے لئے کیسی عظیم بشارت ہے کہ:

"مَا اَكَلَ اَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ اَنْ يَّأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ،

---

[1] اس کی جمع "قراریط" آتی ہے، فتح الباری ج:۴ ص:۴۴۱۔

[2] صحيح بخاری، حديث نمبر:۳۹۳۲، كتاب مناقب الأنصار، باب مقدم النبی صلی الله عليه وسلم۔

[3] صحيح بخاری، حديث نمبر:۲۸۳۷، و ۴۱۰۱ و ۴۱۰۴ و ۴۱۰۵۔

[4] مسند احمد ص:۱۶۷، جلد اوّل، ورجاله رجال الصحيح، قاله العراقی فی الاتحاف شرح الاحياء ج:۷ ص:۹۸۔

[5] شمائل ترمذی، باب ما جاء فی تواضع رسول الله صلی الله عليه وسلم ص:۲۳۔ ومسند احمد ج:۶ ص:۱۲۱۔

وَاِنَّ نَبِیَّ اللّٰہِ دَاوٗدَ عَلَیْہِ السَّلَامُ کَانَ یَأْکُلُ مِنْ عَمَلِ یَدِہٖ۔"

یعنی: "ہر شخص جو کھانا اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھائے (اللہ کے نزدیک) اُس سے بہتر کوئی کھانا نہیں، اور اللہ کے نبی داوٗد علیہ السلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے۔"[1]

بظاہر یہاں "اپنے ہاتھ کی کمائی" سے مراد اپنی محنت کی کمائی ہے، وہ محنت خواہ ہاتھ پاؤں سے ہو یا دِماغ سے۔ چنانچہ حساب کتاب، منصوبہ بندی اور اِنتظامی و دفتری نوعیت کے کام بھی اِن شاء اللہ اس میں داخل ہیں۔

اور اسی حدیث کی ایک روایت میں یہ عظیم بشارت بھی ہے کہ:

"من بات کَالًّا مِّنْ عَمَلِہٖ، بَاتَ مَغْفُوْرًا لہ"[2]

"جس شخص نے اس حالت میں رات کی کہ وہ اپنے کام سے تھک کر چور ہوگیا ہو، تو اس کے سارے (صغیرہ) گناہ معاف ہوگئے (بشرطیکہ وہ کبیرہ گناہوں سے بچتا ہو، جیسا کہ سورۂ نساء کی آیت ۳۱ میں یہ شرط موجود ہے)۔"

۱۰- تاریخِ اسلام میں ایسے جلیل القدر صحابۂ کرام، تابعین، محدثین، علمائے کرام اور اولیاء اللہ کی کمی نہیں جنہوں نے کسبِ معاش کے لئے طرح طرح کے پیشے اِختیار کئے ہوئے تھے، اور تعظیمی القاب کی طرح ان کے ناموں کے ساتھ یہ القاب لگے ہوئے تھے: "زَیَّات" (تیل کا کام کرنے والا)، "دَبَّاغ" (چمڑے کو دَباغت دینے والا)، "حَذَّاء" (جوتوں کا کام کرنے والا)، "ورَّاد" (گلاب کے پھولوں کا کام کرنے والا)، "جَزَّار"

---

[1] صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب کسب الرجل وعملہ بیدہٖ مع فتح الباری ج:۴ ص:۳۰۳۔

[2] فتح الباری، کتاب البیوع، باب کسب الرجل وعمل یدہٖ ج:۴ ص:۳۰۶۔

(قصائی)، "لحّام" (گوشت کا کام کرنے والا)، "قصّار" (دھوبی) وغیرہ وغیرہ، حدیث کی سندوں میں راویوں کے ناموں کے ساتھ اس طرح کے القاب جگہ جگہ آتے ہیں۔

ان مثالوں سے با آسانی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں صنعت وحرفت اور محنت کا کتنا احترام، اور حلال پیشوں کی کیسی عظمت ہے، اور یہ کہ قرونِ اُولیٰ کے اسلامی معاشرے میں کسی حلال پیشے کو عزّت و وقار کے خلاف نہ سمجھا جاتا تھا۔ ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آپ کے سامنے آچکا ہے کہ: سچا امانت دار تاجر انبیائے کرام، صدیقین اور شہداء کے ساتھیوں میں شامل ہے، اور ظاہر ہے کہ ایسا تاجر امانت دار اور دیانت دار نہیں ہو سکتا جو اپنے مزدور و ملازم کے ساتھ ناانصافی اور ظلم کرتا ہو، بے جا مشقت میں ڈالتا یا اس کی تحقیر کرتا ہو۔

محنت کے بارے میں اسلام کی اس رَوِش کے نتیجے میں مزدور کو اِسلامی معاشرے میں جو باوقار برادرانہ مقام حاصل ہوا، پورے اِعتماد و یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ''مزدور'' کی عزّتِ نفس اور اس کے حقوق کی رعایت اس سے بہتر طریقے پر ممکن نہیں۔

صلاحیت (میرٹ Merit) کا معیار

صنعتی تعلقات کے سلسلے میں دُوسرا اُصول جو قرآن وسنت کی روشنی میں سامنے آتا ہے، یہ ہے کہ ملازم (اجیر Labour) دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک اِنتظامیہ سے تعلق رکھنے والے یعنی جن کا کام ذہنی محنت، تنظیم اور منصوبہ بندی ہے۔ دُوسرے جسمانی محنت کرنے والے جنہیں عرفِ عام میں مزدور کہا جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے ان دونوں طرح کے کارکنوں کی صلاحیت کا معیار اُصولی طور پر بتا دیا ہے۔

قسمِ اوّل کا معیار

قسمِ اوّل کا معیار سورۂ یوسف میں سامنے آتا ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکبازی اور دیانت داری اہلِ دربار اور بادشاہِ مصر پر روزِ روشن کی طرح واضح ہوگئی تو بادشاہ نے حکم دیا کہ انہیں میرے پاس لایا جائے تاکہ میں ان کو اپنے (سرکاری کاموں کے) لئے خاص کرلوں، آپ کو اِعزاز کے ساتھ جیل خانے سے لایا گیا، اور باہمی گفتگو سے یوسف علیہ السلام کی صلاحیتوں کا مزید اندازہ ہوگیا تو بادشاہ نے کہا:

"اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ ﴿۵۴﴾"

"آج سے تم ہمارے نزدیک بڑے معزز اور امانت دار ہو۔"

(سورۂ یوسف: ۵۴)

پھر بادشاہ نے اپنے خواب کی تعبیر آپ سے براہِ راست تفصیل سے سنی اور پوچھا کہ اتنے بڑے سات سالہ قحط میں معاشی و مالیاتی اُمور کا اِنتظام اور منصوبہ بندی بڑا بھاری

کام ہے، یہ اِنتظام کس کے سپرد کیا جائے؟ آپ نے فرمایا:

اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَآئِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ۝٥٥

”مجھے ملکی خزانوں پر مقرّر کر دیجئے، میں (ان کی) حفاظت (بھی) کر سکتا ہوں اور (آمد و خرچ کے اِنتظام، اور اس کے حساب کتاب کے طریقوں سے بھی) خوب واقف ہوں۔“ (سورۂ یوسف: ۵۵)

یہاں قرآنِ حکیم نے تین لفظوں (۱) امین (۲) حفیظ اور (۳) علیم میں ان تمام اوصاف کو جمع کر دیا ہے جو ایک انتظامی عہدے دار خصوصاً مالیاتی اُمور کے منتظم میں ہونے چاہئیں۔

کیونکہ سب سے پہلی ضرورت تو اس کی ہے کہ وہ ”امین“ یعنی امانت دار ہو، جس میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ قول و فعل کا سچا ہو، اور اپنے فرائضِ منصبی کو دیانت داری، خیر خواہی اور احساسِ ذمہ داری کے ساتھ ادا کرنے میں دانستہ کوتاہی کرنے والا نہ ہو۔

دُوسری ضرورت یہ ہے کہ وہ ”حفیظ“ یعنی حفاظت کرنے والا ہو کہ اپنے زیرِ انتظام وسائلِ اموال اور ساز و سامان کو ضائع یا خراب نہ ہونے دے، اپنے قابو میں رکھے، اور فرائضِ منصبی کے سلسلے میں جو راز اس کے پاس آئیں، ان کی بھی پوری حفاظت کر سکے۔

تیسری ضرورت اس کی ہے کہ وہ ”علیم“ ہو یعنی فرائضِ منصبی کے لئے جن علوم وفنون کی ضرورت ہے، ان کا حامل ہو، وسائل اور اموال کو جہاں جس قدر خرچ کرنا ضروری ہے اس کا صحیح اندازہ کر سکے تاکہ ضرورت کے مواقع میں کوتاہی نہ کرے اور مقدارِ ضرورت سے زائد خرچ نہ کرے۔

خلاصہ یہ کہ قسمِ اوّل یعنی اِنتظامیہ سے تعلق رکھنے والے کارکنوں اور عہدے داروں کے لئے صلاحیت کا معیار یہ ہے کہ وہ (۱) امانت دار (۲) حفاظت کرنے والے، اور (۳) متعلقہ علوم وفنون کے حامل ہوں۔

قسمِ دوم کا معیار

اور قسمِ دوم کے کارکنوں یعنی جسمانی محنت کرنے والوں کا معیارِ صلاحیت حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصے میں آیا ہے، جو قرآنِ حکیم کے اِرشاد کے مطابق "مَدْیَن" نامی بستی میں پیش آیا۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی ایک صاحبزادی نے اپنے والد[1] بزرگوار کو مشورہ دیا کہ:

یٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ٘ اِنَّ خَیْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ ﴿۲۶﴾

"ابا جان! (آپ کو آدمی کی ضرورت ہے) آپ ان (موسیٰ علیہ السلام) کو ملازم رکھ لیجئے، کیونکہ بہتر ملازم وہ ہے جو مضبوط اور امانت دار ہو۔" (سورۂ قصص: ۲۶)

ان صاحبزادی کی زبان پر اللہ تعالیٰ نے بڑی حکمت کی بات جاری فرمائی، جس کا حاصل یہ ہے کہ "بہتر اَجیر" وہ ہے جس میں دو صفات ہوں، ایک کام کی قوت وصلاحیت، دُوسرے امانت داری، معلوم ہوا کہ مطلوبہ جسمانی قوت[2] اور امانت داری کے بغیر کوئی اَجیر "اچھا اَجیر" نہیں ہوسکتا۔

---

[1] یہ والدِ بزرگوار کون تھے؟ اس میں مفسرین نے اختلاف نقل کیا ہے، مگر آیاتِ قرآن سے ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعیب علیہ السلام تھے، کیونکہ قرآنِ کریم نے حضرت شعیب علیہ السلام ہی کے بارے میں یہ بتایا ہے کہ اُنہیں "مَدْیَن" میں رسول بنا کر بھیجا گیا تھا، کما فی قوله تعالیٰ: "وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا" (پورے قصے کی تفصیل کے لئے قرآنِ کریم کی سورۃ القصص کی طرف مع تفسیر رجوع کیا جائے، مثلاً تفسیر معارف القرآن ج:۶ ص:۶۱۸، سورۃ القصص، بحوالہ تفسیر قرطبی۔)

[2] جسمانی قوت کا اندازہ کنویں پر سے بہت بھاری پتھر تنہا اُٹھا لینے سے، اور اَمانت داری کا تجربہ راستے میں ان صاحبزادی کو اپنے پیچھے کردینے سے ہوچکا تھا (تاکہ نامحرم خاتون پر نظر نہ پڑے)۔ تفسیر معارف القرآن ج:۶ ص:۶۱۸۔

امانت داری دونوں قسم میں ضروری ہے

یہاں یہ بات خصوصی توجہ کی طالب ہے کہ دونوں قسم کے اہل کاروں اور کارکنوں کی باقی مطلوبہ صفات تو مختلف ہیں، لیکن امانت داری کی صفت کو دونوں جگہ معیار کے طور پر ذکر فرمایا گیا ہے، معلوم ہوا کہ امانت داری ہر قسم کے کارکن، عہدے دار، ملازم اور مزدور میں ہونی ضروری ہے۔ قرآن وسنت میں امانت داری کی جگہ جگہ بڑی تاکید آئی ہے، کچھ آیات واحادیث آگے بھی آئیں گی، دو حدیثیں یہاں ملاحظہ ہوں:

''حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ایسا کم ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کوئی خطبہ دیا ہو اور اس میں یہ ارشاد نہ فرمایا ہو کہ:

"لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا اَمَانَةَ لَهُ، وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ" [۱]

''جس میں امانت داری نہیں اس میں ایمان نہیں، اور جس شخص میں معاہدے کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں۔''

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے منافق کی تین علامتیں بیان فرمائی ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ:

"وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ" [۲]

''جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو اس میں خیانت کرے۔''

آج کل عہدوں اور ملازمتوں کے لئے دُوسری صلاحیتوں اور ڈگریوں کو تو دیکھا

۱۔ شرح السنہ، حدیث:۳۸ ج:۱ ص:۷۵، قال الإمام البغوی رحمه الله: "هٰذا حديث حسن" وقال محشيه: "وهو كما قال، بل هو حديث جيد قوي"۔ ورواه الإمام احمد فی المسند ج:۳ ص:۱۳۵، ۱۵۴، والبيهقی فی السنن الكبرىٰ۔

۲۔ صحیح مسلم، حدیث:۸ باب خصال المنافق، كتاب الإيمان، ج اوّل۔

جاتا ہے مگر دیانت وامانت کی طرف توجہ نہیں کی جاتی، اسی کا نتیجہ ہے کہ رشوت خوری، اقربا پروری، کام چوری، احساسِ ذمہ داری کے فقدان اور طرح طرح کی بدعنوانیوں کے باعث ہمارے سرکاری اِداروں میں کارکردگی کا کوئی معیار باقی نہیں رہا، اور تجارتی وصنعتی اِداروں میں بھی تیزی سے گررہا ہے، پاکستانی تجارت دُنیا بھر میں بدنامی کا سامنا کررہی ہے، ہمارے سرکاری تعلیمی اِدارے اور ذرائع ابلاغ نہ صرف یہ کہ امانت ودیانت داری کو پروان نہیں چڑھا رہے بلکہ رہی سہی امانت ودیانت کا بھی بیج مار دینے پر تلے نظر آتے ہیں۔ پھر کرپشن ہی ہماری شناخت بن کر رہ گئی ہے تو تعجب کیوں ہو؟

(۳)

کوٹہ سسٹم کے بجائے صلاحیت (میرٹ)

صنعتی تعلقات کے بارے میں تیسرا اُصول۔ جو مذکورہ بالا تفصیل کے ضمن میں خود بخود آ گیا ہے، یہ ہے کہ اسلام میں ملازمت اور مزدوری میں ''کوٹے'' کا اُصول نہیں بلکہ جیسا کہ آگے کی آیات واحادیث سے مزید وضاحت ہو جائے گی، مدار اہلیت وصلاحیت پر رکھا گیا ہے، یہ نہیں ہے کہ کوئی نااہل آدمی آ کر مطالبہ کرے کہ ''میں چونکہ فلاں علاقے کا باشندہ ہوں اس لئے مجھے فلاں ملازمت پر ضرور لگائیے، ورنہ آپ ظالم ہوں گے۔'' آج کل جو کوٹہ سسٹم پاکستان کے بعض علاقوں میں رائج اور نافذ ہے کہ مختلف علاقوں کے لئے ملازمتوں کے کوٹے مقرّر ہیں، ایک علاقے کے کوٹے میں دُوسرے علاقے کا آدمی نہیں رکھا جا سکتا اگرچہ وہ کتنا ہی قابل اور امین کیوں نہ ہو، اور اس علاقے کا آدمی کتنا ہی غلط کار نااہل ہو۔ اسلام میں اس کا کوئی تصوّر نہیں، اگر کوئی شخص اہلیت وصلاحیت میں دُوسرے اُمیدواروں کے مقابلے میں ناقص ہے تو پھر یہ نااِنصافی کی بات ہے کہ وہ پھر بھی اسی جگہ ملازمت پر اِصرار کرے، دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کے بجائے کوئی دُوسرا کام دیکھے۔

متعلقہ سرکاری حکام پر، اور نجی شعبے کے ان تمام بااِختیار ذمہ داروں پر بھی جو اپنے اِداروں کے تنہا مالک نہیں شرعاً لازم ہے کہ وہ ساری تقرّریاں اہلیت وامانت داری ہی کی بنیاد پر کریں خواہ اُمیدوار کسی بھی علاقے کے باشندے ہوں، اُوپر کی مثالوں میں بھی حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کا وزیرِ خزانہ بنایا گیا، (بعد میں تو سارے شاہی اِختیارات بھی انہی کی طرف منتقل کر دیئے گئے تھے)۔ حالانکہ مصر ان کا اصلی وطن نہ تھا، اور موسیٰ علیہ

السلام کو مدین میں ملازمت ملی، جبکہ ان کا وطن مصر تھا۔ خلاصہ یہ کہ تقرر کرنے والے حکام اور افسران کا دینی فریضہ ہے کہ وہ مقامی اور غیر مقامی کے اِمتیاز کے بغیر ساری تقرریوں میں اہلیت وامانت داری ہی کو معیار بنائیں۔ ذاتی مفادات، ذاتی پسند یا کسی قسم کے تعصّبات یا کسی کی سفارش کو اس اہم فریضے کی ادائیگی میں حائل نہ ہونے دیں، کہ تقرّر کرنے کا یہ اِختیار بھی ایک امانت ہے، اس میں خیانت کرنا اور باصلاحیت لوگوں کے ہوتے ہوئے نااہلوں کو مسلط کر دینا، ان تمام لوگوں پر ظلم ہے جن کے حقوق اس اِدارے سے وابستہ ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن وسنت کی چند ہدایات یہ ہیں۔

قرآنِ حکیم کا فرمان ہے کہ:

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا

''بلاشبہ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کو ان کی امانتیں پہنچادو۔''

(سورۂ نساء:۵۸)

اس آیت کا نزول ایک اہم عہدہ سپرد کرنے ہی کے واقعے میں ہوا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کعبہ مکرمہ کی خدمت کو اِسلام سے پہلے بھی بڑا اِعزاز سمجھا جاتا تھا، چنانچہ بیت اللہ کی مختلف خدمتیں باصلاحیت لوگوں میں تقسیم کی جاتی تھیں، اور جو لوگ بیت اللہ کی کسی خاص خدمت کے لئے منتخب ہوتے تھے وہ پوری قوم میں معزّز وممتاز سمجھے جاتے تھے، زمانۂ جاہلیت سے ایامِ حج میں حجاج کو زَمزم پلانے کی خدمت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے سپرد تھی، اس خدمت کو "سِقایہ" کہا جاتا تھا، بعض خدمتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دُوسرے چچا ابوطالب کے سپرد تھیں، اسی طرح بیت اللہ کی کنجی رکھنا اور مقرّرہ ایام میں کھولنا بند کرنا عثمان بن طلحہ سے متعلق تھا۔

حضرت عثمان بن طلحہ رضی اللہ عنہ کا اپنا بیان ہے کہ جب مکہ مکرمہ فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلا کر بیت اللہ کی کنجی طلب فرمائی، آپ بیت اللہ میں تشریف لے گئے اور وہاں نماز پڑھ کر باہر تشریف لائے تو کنجی مجھے واپس کرتے ہوئے فرمایا ''لو'' اب یہ

کنجی ہمیشہ تمہارے ہی خاندان کے پاس رہے گی، جو شخص تم سے یہ کنجی واپس لے گا وہ ظالم ہوگا۔ اور ساتھ ہی یہ ہدایت بھی فرمائی کہ بیت اللہ کی اس خدمت کے صلے میں تمہیں جو مال مل جائے اسے شرعی قاعدے کے موافق استعمال کرنا۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس روز جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیت اللہ سے باہر تشریف لائے تو یہ آیت آپ کی زبان مبارک پر تھی (جو اُوپر ذِکر کی گئی) فرماتے ہیں کہ اس سے پہلے میں نے یہ آیت کبھی آپ سے نہیں سنی تھی، ظاہر یہ ہے کہ یہ آیت اسی وقت کعبہ معظّمہ میں نازل ہوئی تھی، اسی آیت کی تعمیل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن طلحہ کو بلا کر کنجی ان کو سپرد فرمائی۔ (جس سے معلوم ہوا کہ حضرت عثمان ابن طلحہ ہی اس منصب کے اہل اور مستحق تھے)، اور اس پر سب کا اِتفاق ہے کہ آیت کا شانِ نزول اگرچہ کوئی خاص واقعہ ہو لیکن حکم عام ہوتا ہے، جس کی پابندی پوری اُمت کے لئے ضروری ہے۔

اس جگہ یہ بات غور طلب ہے کہ قرآنِ حکیم نے یہاں لفظ ''امانات'' استعمال فرمایا ہے جو "اَمَانَۃٌ" کی جمع ہے، اس میں اِشارہ ہے کہ امانت صرف یہی نہیں کہ کسی کا کوئی مال کسی کے پاس رکھا ہو جس کو عام طور پر اُمانت کہا اور سمجھا جاتا ہے، بلکہ امانت کی کچھ اور قسمیں بھی ہیں، جو اَحادیث میں بیان کی گئی ہیں مثلاً مشورے کا امانت ہونا، اور راز کا امانت ہونا وغیرہ۔ جو واقعہ آیت کے نزول کا ابھی ذِکر کیا گیا خود اس میں بھی کوئی مالی امانت نہیں، بیت اللہ کی کنجی کوئی مال نہ تھا، بلکہ یہ کنجی خدمتِ بیت اللہ کے ایک عہدے کی نشانی تھی۔

تمام عہدے امانت ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ منصب اور عہدے جتنے ہیں وہ سب اللہ کی امانتیں ہیں جس کے امین وہ حکام اور افسر ہیں جن کے ہاتھ میں تقرّر اور معزول کرنے کے اِختیارات

ہیں، جس طرح امانت صرف اسی کو اَدا کرنا چاہئے جو اس کا مالک ہے، کسی فقیر مسکین پر رحم کھا کر دُوسرے کی امانت اس کو دے دینا جائز نہیں، یا کسی رشتہ دار یا دوست کا حق ادا کرنے کے لئے کسی اور کی امانت اس کو دے دینا جائز نہیں، اسی طرح حکومت اور مشترک اِداروں کے عہدے بھی امانتیں ہیں، اور ان امانتوں کے مستحق صرف وہ لوگ ہیں جو اپنی صلاحیتِ کار اور قابلیت میں بھی اس عہدے کے لئے مناسب اور موجودہ لوگوں میں سب سے بہتر ہوں، اور دیانت وامانت داری میں بھی ان پر فوقیت رکھتے ہوں ان کے سوا کسی اور کو یہ عہدہ سپرد کر دینا خیانت ہے۔[1]

چنانچہ جب حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ مجھے بھی کسی جگہ کا حاکم مقرّر فرمالیں، تو آپ نے یہ کہہ کر انکار فرمادیا کہ:

"یَا اَبَا ذَرٍّ! اِنَّکَ ضَعِیْفٌ وَاِنَّھَا اَمَانَۃٌ، وَاِنَّھَا یَوْمَ الْقِیَامَۃِ خِزْیٌ وَنَدَامَۃٌ اِلَّا مَنْ اَخَذَھَا بِحَقِّھَا وَاَدَّی الَّذِیْ عَلَیْہِ فِیْھَا۔"

''اے ابوذر! تم ضعیف آدمی ہو، اور منصب ایک امانت ہے جس کی وجہ سے قیامت کے دن ذِلت ورُسوائی ہوگی، سوائے اس شخص کے جس نے امانت کا حق پورا کر دیا ہو، (یعنی وہ ذِلت سے بچ جائے گا)۔''[2]

نااہلوں کو عہدہ دینا خیانت ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے کہ:

"مَنِ اسْتَعْمَلَ رَجُلًا مِنْ عِصَابَۃٍ وَفِیْھِمْ مَنْ ھُوَ اَرْضٰی اللہُ مِنْہُ فَقَدْ خَانَ اللہَ، وَرَسُوْلَہٗ وَالْمُؤْمِنِیْنَ"

---

[1] اس آیت سے متعلق یہ ساری تفصیل تفسیر معارف القرآن ج:۲ ص:۴۴۴ تا ۴۴۷ سے مأخوذ ہے۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، حدیث: ۴۶۸۴۔

''جس نے کچھ لوگوں میں سے کسی ایسے شخص کو کوئی عہدہ سپرد کردیا جس سے بہتر آدمی ان میں موجود تھا تو اس نے اللہ سے خیانت کی، اور اس کے رسول سے، اور سب مسلمانوں سے۔''
(الترغیب والترہیب)[۱]

آج جہاں سرکاری اور نجی اِداروں میں نظام کی ابتری نظر آتی ہے وہ سب قرآن وسنت کی اس تعلیم کو نظر اَنداز کردینے کا نتیجہ ہے کہ تعلقات، سفارشوں اور رِشتوں سے عہدے تقسیم کئے جاتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نااہل لوگ عہدوں پر قابض ہوکر خلقِ خدا کو پریشان کرتے ہیں، اور سارا نظام برباد ہوجاتا اور معاشرہ ظلم وفساد سے بھر جاتا ہے۔ اسی لئے جب ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا:

''قیامت کب آئے گی؟ تو آپ نے فرمایا: "اذا ضُيِّعَتِ الْاَمَانَةُ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ" ''جب امانت کو ضائع کردیا جائے تو قیامت کا اِنتظار کرو۔'' (صحیح بخاری)[۲]

معلوم ہوا کہ نااہلوں کو عہدوں پر مسلط کردینا ایسی خطرناک اور دُوررَس خیانت ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے اِصلاحِ فساد کی توقع بے سود ہے، صرف قیامت ہی کا اِنتظار کیا جاسکتا ہے۔

---

[۱] باب "من ولی شيئا من امور المسلمين" قال المنذری (وهو مؤلف الترغيب والترهيب) رواه الحاكم من طريق حسين بن قيس عن عكرمة عنه، وقال "صحيح الاسناد" قال الحافظ: وحسين هذا هو حنش: واه۔ وقال المنذری نفسه فی الباب قبله "حسين بن قيس المعروف بحنش وقد وثقه ابن نمير وحسّن له، والترمذی غير ما حديث صحيح له الحاكم، ولا يضر فی المتابعات (الترغيب والترهيب باب ترهيب من ولی شيئًا من امور المسلمين وباب ترغيب من ولی شيئًا من امور المسلمين ج:۳ ص:۱۲۳، ۱۲۵)۔

[۲] صحيح البخاری، كتاب العلم، باب من سئل علمًا وهو مشتغلٌ فی حديثه الخ رقم الحديث:۵۷۔

ایک اِستثنائی صورت

ہاں اگر کوئی شخص کسی اِدارے کا تنہا مالک ہے وہ اپنی مرضی سے، یا کمپنی کے تمام شرکاء باہمی رضامندی سے کسی بے صلاحیت آدمی کو مالی اِمداد پہنچانے کے لئے ملازم رکھ لیں تو اس میں شرعاً کوئی قباحت نہیں، کیونکہ یہ ان کا خالص ذاتی معاملہ ہے، اور اپنی ذاتی ملکیت تک محدود ہے۔ جس کا ضرر کسی اور کو لاحق نہیں ہوتا، پھر اس میں ایک کمزور ونادار انسان کی ایسی مالی اعانت ہے جس سے اس کی عزّتِ نفس اور خودداری بھی محفوظ رہتی ہے، ایسا اِحسان اور اِیثار کا معاملہ شرعاً پسندیدہ ہے اور ملازم رکھنے والوں کے لئے بھی خیر و برکت کا باعث ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے کہ:

"اِنَّمَا تُرْزَقُوْنَ وَتُنْصَرُوْنَ بِضُعَفَائِکُمْ"[1]

''تم کو (اللہ کی طرف سے) رزق اور اِمداد تمہارے کمزور لوگوں ہی کی وجہ سے (یا برکت سے) ملتی ہے۔''

نیز سرکاری یا نجی اِداروں میں ملازمت کے کئی اُمیدوار اگر اہلیت وصلاحیت میں مجموعی طور پر مساوی درجہ رکھتے ہوں، پھر ان میں سے بعض کو ان کی زیادہ حاجت مندی کی بناء پر، یا کسی خاص علاقے کے لوگوں کو مقامی ہونے کی بناء پر ترجیح دے دی جائے تو اس میں بھی شرعاً کوئی حرج نہیں، بلکہ ایسا کرنے میں بسا اوقات بہت سی مصلحتیں بھی ہوتی ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ کام کی صلاحیت اور امانت ودیانت داری میں وہ دُوسرے اُمیدواروں سے کم نہ ہوں۔[2]

---

[1] مسند احمد عن ابی الدرداء ج:۵ ص:۱۹۸۔ یہ حدیث الفاظ کے کچھ فرق سے صحیح بخاری میں بھی آئی ہے، دیکھئے حدیث نمبر:۲۸۹۶، کتاب الجهاد، باب من استعان بالضعفاء والصالحين في الحرب۔

[2] تفسیر معارف القرآن ج:۲ ص:۴۴۹، سورۂ نساء آیت:۵۸۔

(۴)

معاہدۂ ملازمت

صنعتی تعلقات کے بارے میں ایک اہم اُصول جو قرآن وسنت اور فقہی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے، یہ ہے کہ ملازمت کے آغاز پر اَجیر وآجر کے درمیان ایک معاہدہ طے پانا چاہیے جس میں کام کی نوعیت، وقت کی مقدار، کام کی جگہ، تنخواہ، اور جو مزید سہولتیں جائز طور پر فریقین ایک دُوسرے سے لینے کے طالب ہوں ان کی وضاحت کی جائے، نیز تعطیلات اور رُخصتوں کی تفصیل، مدّتِ ملازمت، اور ملازمت کو ختم کرنے کے فریقین کے اختیارات بھی طے ہونے چاہئیں۔ ملازمت ومزدوری کو شرعی اِصطلاح میں ''اِجارہ'' کہا جاتا ہے، اگر یہ اُمور طے نہ ہوں تو اَجیر (Labour) و آجر (Entreprencur) کے درمیان آئے دن نزاعات پیدا ہوتے رہتے ہیں، فقہی اِصطلاح میں ایسا مبہم اِجارہ ''فاسد'' اور گناہ ہے جو باہمی نزاعات کا باعث بنتا ہو، اُسے فسخ (کینسل) کردینا واجب ہے۔

قرآنِ حکیم نے بتایا ہے کہ جب آجر (حضرت[1] شعیب علیہ السلام) نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملازمت پر لگانا چاہا تو ان سے فرمایا:

''قَالَ اِنِّیۡۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اُنۡكِحَكَ اِحۡدَی ابۡنَتَیَّ هٰتَیۡنِ عَلٰۤی اَنۡ تَاۡجُرَنِیۡ ثَمٰنِیَ حِجَجٍ ۚ فَاِنۡ اَتۡمَمۡتَ عَشۡرًا فَمِنۡ عِنۡدِكَ ۚ وَمَاۤ اُرِیۡدُ اَنۡ اَشُقَّ عَلَیۡكَ ؕ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۲۷﴾

---

[1] قرآنِ حکیم نے اس واقعے میں یہ نہیں بتایا کہ آجر کون بزرگ تھے، لیکن بعض قرائن وشواہد کی بناء پر بہت سے حضراتِ مفسرین ومحدثین کا رُجحان اسی طرف ہے کہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔

''میں چاہتا ہوں کہ ان دولڑکیوں میں سے ایک کا نکاح تم سے کردوں، اس شرط پر کہ تم آٹھ سال میری ملازمت کرو، پھر اگر تم دس سال پورے کردو تو یہ تمہاری طرف سے (اِحسان) ہوگا (یعنی یہ شرطِ ملازمت نہیں)۔ اور میں تم پر کوئی مشقت ڈالنا نہیں چاہتا (کام لینے وغیرہ میں آسانی برتوں گا) تم مجھ کو اِن شاء اللہ نیک لوگوں میں سے پاؤ گے۔'' (سورۂ قصص: ۲۷)

حضرت شعیب علیہ السلام کے گھر میں چونکہ کوئی اور مرد باہر کے کام کرنے والا نہیں تھا، اس لئے بکریاں چَرانے وغیرہ کا کام متعین تھا جو دونوں کو معلوم تھا، جگہ متعین تھی، مدّتِ ملازمت بھی آٹھ سال بیان کردی گئی، اُجرت بتادی گئی کہ اپنی بیٹی نکاح میں دے دُوں گا، (اس زمانے میں یہ شرعاً جائز تھا کہ نکاح کو اُجرت قرار دے دیا جائے)، ایک حدیث میں صراحت ہے کہ اُجرت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کھانا بھی آجر (حضرت شعیب علیہ السلام) کے ذمے طے ہوا تھا۔[1] خلاصہ یہ کہ آجر اور اَجیر کے درمیان اس زمانے میں جن باتوں کی وضاحت ضروری تھی وہ آجر نے بیان کردیں، اور یہ بھی واضح کردیا کہ میں تمہیں مشقت اور تکلیف میں نہیں ڈالوں گا جس اچھے سلوک کی کسی نیک انسان سے توقع کی جاتی ہے وہ تم کو حاصل ہوگا۔ یہ آجر کی طرف سے پیشکش اور وعدہ ہوا جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

''ذٰلِكَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ ۭ اَيَّمَا الْاَجَلَيْنِ قَضَيْتُ فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي مَا نَقُوْلُ وَكِيْلٌ ۝۲۸

''یہ بات میرے اور آپ کے درمیان طے ہوگئی، میں ان دو مدتوں

---

[1] سنن ابن ماجة، باب إجارة الأجير على طعام بطنه ص:۱۷۸، لیکن اس حدیث کی ہر سند میں کچھ نہ کچھ ضعف پایا جاتا ہے، دیکھئے فتح الباری ج:۴ ص:۴۴۵، تفسیر ابن کثیر ج:۳ ص:۳۸۵۔

میں سے جس کو بھی پورا کر دُوں تو مجھ پر کوئی جبر نہ ہوگا، (یعنی آٹھ
سال سے زائد مدّت مجھ پر لازم نہ ہوگی) اور ہم جو (معاہدہ کی)
بات کر رہے ہیں، اللہ اس کا گواہ ہے (اس کو حاضر و ناظر جان کر عہد
پورا کرنا چاہئے)۔" (سورۃ القصص:۲۸)

ملازمت و مزدوری کی طرح خرید و فروخت میں بھی ایسے اُمور کی وضاحت شرعاً واجب ہے جن میں اِبہام رہ جانے کے باعث نزاعات پیدا ہوتے ہیں، ورنہ وہ سودا "فاسد" ہوجاتا ہے، اور شرعاً ناجائز ہے اور اُسے فسخ کرنا واجب ہے، جس کی تفصیلات احادیث اور فقہ میں خوب کھول کر بیان کر دی گئی ہیں۔ چنانچہ خرید و فروخت کرنے والے دونوں فریقوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد یہ ہے کہ:

"فَإِنْ صَدَقَا وَبَيَّنَا بُوْرِكَ لَهُمَا فِيْ بَيْعِهِمَا، وَإِنْ كَذَبَا وَكَتَمَا مُحِقَتْ بَرَكَةُ بَيْعِهِمَا"

"پس اگر انہوں نے سچ بولا اور (متعلقہ تمام باتوں کو) واضح کر دیا تو
ان کے سودے میں ان کے لئے برکت ڈال دی جاتی ہے، اور اگر
جھوٹ بولا اور (متعلقہ باتوں کو) چھپایا تو ان کے سودے سے
برکت مٹا دی جاتی ہے۔"[1]

خلاصہ یہ کہ ملازمت و مزدوری کا معاملہ کرتے وقت فریقین کو چاہئے کہ تمام ایسی باتیں جو بعد میں عموماً وجہ نزاع بنتی ہیں خوب وضاحت کے ساتھ طے کر لی جائیں، بلکہ قرآن و سنت کی تعلیمات کا تقاضا یہ ہے کہ ملازمت کا معاہدہ ضبطِ تحریر میں لایا جائے، کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا اُدھار معاملہ ہوتا ہے، اَجیر کام پہلے کرتا ہے اور تنخواہ اسے بعد میں (ہفتہ یا مہینے کے اِختتام پر) ملتی ہے، اور اُدھار کا معاملہ کرتے وقت قرآنِ حکیم نے یہ ہدایت بڑی تاکید سے فرمائی ہے کہ اس کی دستاویز پوری وضاحت کے ساتھ لکھی جائے بلکہ اس پر گواہ

[1] صحیح مسلم، کتاب البیوع، باب الصدق فی البیع والبیان، رقم الحدیث:۲۸۲۵۔

بھی بنا لئے جائیں، تاکہ نزاع کی صورت میں معاملہ عدالت تک پہنچے تو حق دار کا حق ثابت کیا جاسکے۔

ایسی دستاویز کی شرعی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ قرآنِ حکیم نے اسے لکھنے کی تفصیلات جس آیت میں بیان فرمائی ہیں، اور جو قانونِ معاہدات کے بھی اہم اُصولوں پر مشتمل ہے وہ قرآنِ کریم کی سب سے طویل آیت ہے (یعنی سورۂ بقرہ کی آیت ۲۸۲) جسے "آیۃ المداینۃ" کہا جاتا ہے، احادیث اور فقہ کی کتابوں میں بھی ایسی دستاویزات کے بارے میں مستقل باب ملتے ہیں، مثلاً حدیثوں کی مشہور کتاب جامع ترمذی میں "کتابۃ الشروط" کے نام سے، اور فقہ کی مشہور کتاب فتاویٰ عالمگیریہ میں "کتاب المحاضر والسجلات" کے نام سے۔

غرض اگر شریعت کی اس ہدایت کا سب اہتمام کریں تو آجر و اَجیر کے درمیان پیش آنے والے نزاعات کا بڑی حد تک سدِ باب ہوسکتا ہے، اور بہت سی وہ باتیں جو "بعد از خرابی بسیار" عدالتوں یا ٹریڈ یونینوں کے ذریعے طے کرنی پڑتی ہیں، پہلے ہی باہمی رضامندی سے نمٹائی جاسکتی ہیں، عدالتوں میں مقدمات کی جو بھرمار ہے اس میں بھی قابلِ ذکر کمی واقع ہوسکتی ہے۔

(۵)

ہر فریق کا حق دُوسرے کا فریضہ

صنعتی تعلقات کے بارے میں ایک اور اہم اُصول جو قرآن وسنت کی روشنی میں حاصل ہوا ہے، وہ یہاں عرض کرنا چاہتا ہوں، اور اس سے پہلے اس پر توجہ دِلانا چاہتا ہوں کہ آج کل حقوق کے مطالبوں کا بہت زور ہے، بے شمار انجمنیں اور تنظیمیں شب وروز اسی دُھن میں نظر آتی ہیں، لیکن حقوق ہیں کہ ملنے نہیں پاتے، یا پورے نہیں ملتے۔ آجر کو شکایت ہے کہ کارکن اور مزدور کام پورا نہیں کرتے، اور مزدور نالاں ہے کہ آجر نے اس کے حقوق ہڑپ کر لئے ہیں۔ یہی کشمکش عوام اور حکومت کے درمیان جاری ہے، گھریلو زندگی میں بھی جگہ جگہ یہی کھینچ تان میاں بیوی کے درمیان، ساس بہو کے درمیان، اور بھائی بھائی کے درمیان نظر آتی ہے۔ ہر فریق شاکی ہے کہ اس کی حق تلفی ہو رہی ہے۔ اب تو یہ نزاعات تعلیمی اِداروں کا بھی روزمرّہ بنتے جا رہے ہیں، آخر یہ حقوق کیوں نہیں ملتے؟

غور کیا جائے تو عموماً ان حق تلفیوں اور سارے جھگڑے فساد کی جڑ یہ نظر آئے گی کہ ہر فریق اپنے ذمہ کے فرائض پورے ادا کرنے کی فکر نہیں کر رہا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ قرآن وسنت کی تعلیمات میں جتنا بھی غور کیا جائے یہ حقیقت واضح ہوتی چلی جائے گی کہ دُنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر چھوٹے بڑے انسان کے بہت سے حقوق کو دُوسروں سے وابستہ کیا ہے اور ان کا فریضہ قرار دیا ہے، معاہدہ سیاسی ہو یا دِفاعی، سماجی ہو یا معاشی، تحریری ہو یا زبانی، لفظی ہو یا رِواجی، کسی بھی قسم کا جائز معاہدہ ہو، اس کی رُو سے ہر فریق کا حق دُوسرے کا دِینی فریضہ بن جاتا ہے، گاہک کا یہ حق کہ خریدی ہوئی چیز اسے پوری صحیح وقت پر مل جائے، تاجر کا فریضہ ہے، اور تاجر کا یہ حق

کہ طے شدہ قیمت اسے مقرّرہ وقت پر پوری مل جائے، گاہک کا فریضہ ہے۔ اسی طرح آجر (Entreprencur) کا یہ حق کہ طے شدہ کام یا محنت اسے مقرّرہ وقت پر پوری ملے، اُجیر کا فریضہ ہے، اور اُجیر (Labour) کا یہ حق کہ محنت کا طے شدہ پورا صلہ اسے صحیح وقت پر مل جائے، آجر کا فریضہ ہے۔ غرض قرآن وسنت کی رُو سے ہر فریق کا حق دُوسرے کا فریضہ ہے۔ مزدور کا حق آجر کا فریضہ، اور آجر کا حق مزدور کا فریضہ۔

اب اگر ہر فریق اپنا حق تو پورا لینا چاہے، اور دُوسرے کا حق دینے کو تیار نہ ہو، تو نتیجہ وہی نکلے گا جو سامنے ہے کہ حق صرف ایک نعرہ بنا رہے گا، ملے گا کسی کو نہیں، اور دُنیا جھگڑے فساد کا دوزخ بنی رہے گی۔ حقوق ملنے کا راستہ سوائے اس کے نہیں کہ ہر شخص اپنے ذمہ کے فرائض جو دُوسروں کے حقوق ہیں، پوری احساسِ ذمہ داری اور آخرت کی جواب دہی کی فکر کے ساتھ ادا کرتا رہے، یہی وہ واحد راستہ ہے جو ہر ایک کو اس کا حق دِلوانے کا ضامن ہے۔

حقوق مانگنے سے زیادہ اُن کی ادائیگی کی فکر کیجئے

فکرِ آخرت اور خوفِ خدا سے غافل موجودہ خودغرضانہ سیاسی ومعاشی نظام کا ایک تحفہ، جو آزادی اور جمہوریت کے نام پر دُنیا کو ملا ہے، یہ ہے کہ حقوق مانگنے میں سب ایک دُوسرے سے آگے، لیکن ادائے حقوق کی فکر رکھنے والے روز بروز کم ہوتے جارہے ہیں، آزادی اور جمہوریت بس اپنے حقوق منوانے کے لئے جلسوں، جلوسوں، مظاہروں اور توڑ پھوڑ کرنے کا نام رہ گیا ہے، عملاً ادائے فرض کا کوئی خانہ اس میں نظر نہیں آتا۔ سیاسی اور معاشی میدان میں ساری تنظیمیں اسی یک رُخے پن کا شکار ہیں، کیا کوئی تنظیم ایسی نظر آتی ہے جو اپنے ماننے والوں میں اپنے ذمے کے فرائض، جو دُوسروں کے حقوق ہیں، ادا کرنے کی تبلیغ کررہی ہو؟ سرکاری تعلیمی اِداروں اور ذرائع ابلاغ سے تو اس کی اُمید کرنا بھی اب فضول ہوگیا ہے، نتیجہ سامنے ہے کہ حقوق کسی کو نہیں ملتے، آخری چارۂ کار کے طور پر پولیس

اور عدالتوں کے ذریعے حقوق حاصل کر لئے جاتے تھے، لیکن جہاں پولیس اور عدالتیں بھی اپنے فرائض دیانت داری سے ادا کرنے پر تیار نہ ہوں تو حقوق کس کو ملیں گے؟ اور کیسے ملیں گے؟

اسی لئے اسلام نے ایک فطری دِین ہونے کے ناطے جہاں عدالت واحتساب اور قانونی چارہ جوئی کا ایک مضبوط، آسان اور سستا نظام قائم کیا ہے اسی کے ساتھ اس بنیادی نکتے کو پکڑا ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں میں یہ اِحساسِ ذمہ داری اور یہ فکر پیدا کرنا چاہتا ہے کہ ہر ایک کا حق دُوسرے کا فریضہ ہے، وہ جتنا زور اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے لگاتے ہیں اس سے زیادہ اپنے فرائض ادا کرنے میں لگائیں، کہ یہی وہ راستہ ہے جس کے ذریعے دُنیا امن وچین سے آشنا اور ظلم وفساد سے پاک ہوسکتی ہے، کیونکہ اس طرح اوّل تو پولیس اور عدالتوں تک نزاعات پہنچنے کی نوبت ہی کم آئے گی، اور جب آئے گی اور پولیس اور عدالتیں اپنے اپنے فرائضِ منصبی صحیح طور پر اَدا کر رہی ہوں گی تو کوئی بھی انصاف سے اور اپنے حقوق سے محروم نہ رہے گا، عہدِ رِسالت اور خلفائے راشدین کے دور میں اور بعد میں بھی پرہیزگار مسلم حکمرانوں کے دور میں تاریخ ایسے جنت نظیر معاشرے کا دِلکش منظر دیکھ چکی ہے۔

(۱) اس پر ایک مشہور صحابی کی گواہی

اس کی گواہی مشہور صحابی حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر دی ہے کہ:

> ''مجھ پر ایک ایسا دور آچکا ہے کہ مجھے کسی بھی شخص سے کوئی سودا یا معاہدہ کرنے میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی۔ کیونکہ اگر وہ مسلمان ہوتا تھا تو مجھے اِطمینان تھا کہ اس کا دِین اسے خود مجبور کرے گا کہ وہ میرا پورا حق مجھے دیدے، اور اگر وہ کوئی عیسائی یا یہودی ہوتا تب بھی مجھے یقین تھا کہ اس کا افسر اور حاکم (جو اس زمانے میں

مسلمان ہی ہوتا تھا) میرا حق پورا دِلوا دے گا۔''[1]

اسلام نے اس بنیادی نکتے کو صرف ایک ضابطۂ اَخلاق کی حد تک محدود نہیں[2] رکھا بلکہ اسے ایک اہم دِینی فریضہ قرار دے کر اس پر آخرت کی جزا و سزا مقرّر کی ہے۔[3]

اس سلسلے کی چند آیات واحادیث یہاں پیش کی جارہی ہیں، کاش ہمارے سیاسی رہنما، تاجر تنظیمیں اور مزدوروں کی ٹریڈ یونینیں ان حکیمانہ اور منصفانہ تعلیمات کو مشعلِ راہ بنا کر اپنے موجودہ طریقۂ کار پر نظرِ ثانی فرمائیں، اور اپنے ماننے والوں میں اپنے اپنے فرائضِ منصبی ادا کرنے کا جذبہ، لگن اور فکر پیدا کریں، تاجروں اور صنعتکاروں کی انجمنیں مزدور کے حقوق دینے اور دِلوانے کا اہتمام کریں، کہ یہ ان کا فریضہ ہے، اور مزدور تنظیمیں اپنے ماننے والوں کو کام چوری، اور سستی و کاہلی سے بچنے اور ڈیوٹی امانت داری سے پابندیٔ وقت کے ساتھ انجام دینے کا عادی بنائیں کہ یہ ان کا فریضہ ہے۔ شریعت کی نظر میں جس طرح مزدور کی محنت کا طے شدہ پورا صلہ نہ دینے والا صنعتکار ظالم ہے، اسی طرح وہ مزدور بھی ظالم ہے جو طے شدہ ڈیوٹی دیانت داری سے انجام نہیں دیتا اور کام چوری کا مرتکب ہوتا ہے، یہ کام خدا ترسی اور فکرِ آخرت کے بغیر نہیں ہوسکتا، صرف قانون، عدالتوں اور پولیس کے ذریعے یہ مقصد حاصل نہیں کیا جاسکتا جب تک کہ انسان کی ہر نقل وحرکت پر پہرہ دینے کے لئے فکرِ آخرت موجود نہ ہو۔

اگر یہ کام ہو جائے تو یقیناً دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا معاشرہ اور ہمارا ملک نہ صرف امن وامان کا گہوارہ بن جائے گا بلکہ معیشت اور صنعت وتجارت کے میدان میں بھی ہماری

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب رفع الأمانة جلد اوّل۔

[2] اس کی ضروری تفصیل آگے چھٹے اُصول کے تحت ''ایک شبہ اور اس کا اِزالہ'' کے عنوان سے آئے گی، اِن شاء اللہ۔

[3] اور دُنیا میں بھی عدالتی چارہ جوئی کا نہایت مضبوط، آسان، سستا اور مؤثر نظام قائم کیا ہے جس کا کچھ بیان اِن شاء اللہ آگے ساتویں اُصول کے تحت آئے گا۔

تیز گام ترقی دُنیا کے لئے ایک روشن مثال بن سکے گی۔ جن ملکوں میں یہ کام کسی درجے میں ہورہا ہے اسی درجے میں وہاں اس کے خوشگوار نتائج دیکھے جاسکتے ہیں۔

(۲) اس سلسلے میں قرآنِ حکیم کا وہ فرمان سب سے پہلے یاد دِلانا چاہتا ہوں جو پیچھے بھی ایک مقام پر آچکا ہے کہ:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ

بلاشبہ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کو ان کی امانتیں پہنچادیا کرو، اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرنے لگو تو فیصلہ انصاف سے کرو۔" (سورۂ نساء:۵۸)

ظاہر ہے کہ یہاں امانتوں سے مراد بندوں کے حقوق ہیں، اس آیت میں بھی خطاب حق داروں سے نہیں بلکہ ان لوگوں سے ہے جن کے پاس بندوں کے حقوق ہیں، انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ حق داروں کا حق (ان کے مطالبے کا اِنتظار کئے بغیر) ان تک پہنچائیں، اور یہ پیچھے معلوم ہوچکا ہے کہ ہر عاقل بالغ انسان پر دُوسروں کے کچھ حقوق ہیں، لہٰذا اس آیت کا مخاطب ہر اِنسان ہے، خواہ وہ حاکم ہو یا ماتحت، آجر ہو یا اَجیر، اَمیر ہو یا غریب، گاہک ہو یا تاجر، ہر ایک کے ذمہ دُوسروں کے جو حقوق ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے پاس امانت ہیں، اور حق داروں تک ان حقوق کا پہنچادینا اس کا قانونی فریضہ تو ہے ہی، دِینی فریضہ بھی ہے۔ یہ فریضہ اللہ تعالیٰ پر پورے اِیمان کے بغیر، اپنی اپنی قبر کا دھیان رکھے بغیر، اور آخرت کی جزا و سزا کی فکر کے بغیر پوری طرح ادا نہیں ہوسکتا، اسی لئے اس آیت کو اللہ تعالیٰ نے اس جملے پر ختم فرمایا ہے کہ "اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِيْعًا بَصِيْرًا" یعنی "اللہ تعالیٰ (تمہاری ہر اچھی بُری بات کو) خوب سنتا، اور (ہر اچھے بُرے فعل کو) خوب دیکھتا ہے" (چنانچہ آخرت میں پورا پورا حساب لے کر ہر ایک کو اس کے مطابق جزا یا سزا دینا اس کے لئے کچھ مشکل نہیں)۔

(۳) دُوسروں کا حق مارنے والوں کا حشر

دُوسرے کا حق مار لینے والوں کے بارے میں قرآنِ حکیم کا یہ اِعلان خصوصی توجہ کا طالب ہے کہ:

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝١ الَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝٢ وَاِذَا كَالُوْهُمْ اَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝٣ اَلَا يَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝٤ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝٥ يَّوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝٦

"دردناک[1] عذاب ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کے لئے، جو لوگوں سے جب ناپ کرلیں تو پورا پورا لیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا کر دیں۔ کیا ان لوگوں کو اس کا یقین نہیں ہے کہ وہ ایک بڑے سخت دن (یومِ حساب) میں زندہ کر کے اُٹھائے جائیں گے؟ جس دن تمام انسان رَبّ العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔" (سورۂ تطفیف: ۱ تا ۶)

یہاں جن لوگوں کو دردناک عذاب کی خبر دی گئی ہے ان کی دو صفتیں بیان کی گئی ہیں۔ اوّل یہ کہ جب یہ لوگ دُوسروں سے اپنا حق لیتے ہیں تو پورا پورا لینا چاہتے ہیں۔ دوم یہ کہ جب دُوسروں کو دیتے ہیں تو ان کا حق پورا نہیں دیتے، بلکہ اس میں کمی کرتے ہیں۔

ایک سوال اور جواب

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پہلی صفت میں تو کوئی خرابی نہیں، اپنا حق پورا وصول کر لینا ہر ایک کو جائز ہے، خرابی تو صرف دُوسری صفت میں ہے کہ دُوسروں کو ان کا حق پورا نہ دیا جائے۔ پھر یہاں ان کی پہلی صفت کو بھی مذمت کے طور پر کیوں ذِکر فرمایا گیا؟

مفسرین نے اس کا جواب مختلف طریقوں سے دیا ہے جو سب اپنی اپنی جگہ

---

[1] تفسیر رُوح المعانی ج:۳۰ ص:۶۸ (ناشر مکتبہ رشیدیہ لاہور)۔

دُرست ہیں، البتہ ناچیز کے ذہن میں اس کا ایک جواب یہ آتا ہے کہ شاید پہلی صفت کو دُوسری کے ساتھ ذِکر کرنے میں اس طرف بھی اشارہ ہو کہ اگر لوگ یہ چاہیں کہ اپنا حق تو پورا پورا لے لیں اور دُوسروں کو پورا نہ دیں یہ گھٹیا درجے کی رذالت اور خود غرضی تو ہے ہی، پرلے درجے کی حماقت بھی ہے، کیونکہ جس معاشرے میں ناپ تول میں کمی کا رِواج عام ہو جائے وہاں کسی کو بھی پورا حق ہمیشہ نہیں ملا کرتا، جب دُودھ والا دُودھ میں پانی ملائے گا، یعنی پیسے ایک کلو کے لے کر دُودھ آدھا کلو دے گا، پھر آٹا خریدنے جائے گا تو آٹے والا بھی ڈنڈی مارے گا، اور آٹے والا جب کپڑا لینے جائے گا تو کپڑے والا بھی اپنے ''ہاتھ کی صفائی'' دِکھائے گا۔ ایک نے جو حرام کمایا دُوسرا بھی اس کی جیب سے اتنا ہی یا اس سے بھی زیادہ نکال لے گا، جیب سب کی کٹے گی، حرام خوری کے مرتکب سب ہوں گے، ملے گا کسی کو کچھ نہیں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کی یہ خواہش کہ انہیں اپنا حق پورا پورا ملتا رہے گا، حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

واضح رہے کہ فروخت کی جانے والی اشیاء میں ملاوٹ کرنا بھی ناپ تول میں کمی کرنا ہے، کیونکہ خالص چیز کی جتنی قیمت اُس نے وصول کی ہے اُتنی خالص چیز اُس کو نہیں دی۔

(۴) حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر عذاب

اس جرم کی سنگینی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر جو ہولناک عذاب آیا اور جس کا نقشہ قرآنِ کریم نے جگہ جگہ مختلف انداز میں کھینچا ہے کہ پوری قوم بڑے عبرتناک انداز میں ہلاک کردی گئی، وہ ناپ تول میں کمی کرنے کے سنگین جرم کی عادی تھی۔

(۵) یہ تو پچھلی اُمت کا عبرت ناک عذاب تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو بھی یہ ہولناک خبر سنائی ہے کہ جس قوم میں ناپ تول میں کمی کرنے کا مرض

پھیل جائے، یا فحاشی و عریانی علی الاعلان ہونے لگے ان پر دُنیا میں بھی عذاب آتا ہے، ارشاد ہے کہ:

''جس قوم میں علانیہ طور پر فحاشی ہونے لگے، اُس میں وبائیں آتی ہیں، اور ایسے ایسے مرض اور بیماریاں آتی ہیں جو پچھلے لوگوں میں (زمانۂ ماضی میں) نہیں تھیں۔ اور جو قوم ناپ تول میں کمی کرنے لگتی ہے، اُس پر قحط (اشیائے ضرورت کی قلّت) کا عذاب آتا ہے، اور اس پر (طرح طرح کی) مشکلات کا شدید بوجھ لاد دیا جاتا ہے، اور حکومت کا ظلم مسلط کر دیا جاتا ہے۔''[۱]

آج جبکہ ۲۰۰۹ء چل رہا ہے (اللہ تعالیٰ ہمیں پناہ میں رکھے اور توبہ کی توفیق عطا فرمائے) ہمارا معاشرہ ان دونوں عذابوں میں گرفتار ہے۔

ناپ تول میں کمی کی طرح کام چوری بھی حرام ہے

یہاں قرآنِ کریم میں صرف ناپ تول کا ذِکر ہے، کیونکہ عام طور سے لین دین انہی دو طریقوں سے ہوتا ہے، انہی کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ حق دار کا حق ادا ہو گیا یا نہیں، لیکن یہ معلوم ہے کہ مقصود اس سے ہر حق دار کا حق پورا پورا دینا ہے، اس میں کمی کرنا حرام ہے، تو معلوم ہوا کہ یہ صرف ناپ تول کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر وہ چیز جس سے کسی کا حق پورا کرنا یا نہ کرنا جانچا جاتا ہے اس کا یہی حکم ہے، خواہ ناپ تول سے ہو یا عدد شماری سے یا کسی اور طریقے سے، ہر ایک میں حق دار کے حق سے کم دینا حرام ہے۔

مزدور و ملازم (اجیر) نے جتنے وقت کام کا معاہدہ کیا ہے اس میں سے وقت چُرانا

---

[۱] ابن ماجة عن ابن عمر رضی الله عنه، کتاب الفتن، باب العقوبات ج:۵ ص:۱۹۰۔ قال البوصیری رواهُ الحاکم فی المستدرك قال هذا حدیث صحیح الاسناد (الٰی قوله) هذا حدیث صالح للعمل۔ مصباح الزجاجة ج:۴ ص:۱۸۶۔ قال الهیثمی فی مجمع الزوائد: رواهُ البزار ورجاله ثقات۔

اور کم کرنا بھی اس میں داخل ہے، چنانچہ اتنے وقت کی اُجرت بھی ایسی ہی حرام ہے جیسا چوری کا مال، نیز وقت کے اندر جس طرح محنت سے کام کرنے کا عرف ورِواج میں معمول ہے اس میں سستی کرنا بھی ناپ تول میں کمی کرنے کی طرح حرام ہے۔[1] اس میں عام لوگوں میں بلکہ بہت سے ایسے لوگوں میں بھی جو بظاہر بڑے دِیندار نظر آتے ہیں، غفلت اور لاپروائی پائی جاتی ہے، کہ اپنی ملازمت کے فرائض میں کمی کرنے کو گناہ ہی نہیں سمجھا جاتا۔

بندوں کے حقوق (حقوق العباد) کی نزاکت واہمیت

اور یہ حقوق چونکہ بندوں کے (حقوق العباد) ہیں، اس لئے ان میں کمی کرنا ایسا سخت گناہِ کبیرہ ہے کہ دُوسرے گناہ تو خواہ وہ کتنے ہی بڑے ہوں، سچی توبہ سے معاف ہوجاتے ہیں، لیکن بندوں کے حقوق ان کو اَدا کئے بغیر یا ان ہی سے معاف کرائے بغیر توبہ سے بھی معافی کا وعدہ نہیں کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ اس جرم سے پناہ عطا فرمائے۔

(۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد (حدیثِ قدسی) ہے کہ:

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تین قسم کے لوگ ایسے ہیں کہ قیامت کے دن میں خود ان کے خلاف مدعی بنوں گا، ایک وہ شخص جس نے میرے نام کی قسم کھا کر کوئی معاہدہ کیا، پھر اس کی خلاف ورزی کی، دُوسرا وہ شخص جو کسی آزاد اِنسان کو فروخت کرکے اس کی قیمت کھا گیا، اور تیسرے کے بارے میں یہ الفاظ ہیں کہ:

"وَرَجُلٌ اسْتَاجَرَ اَجِيْرًا فَاسْتَوْفٰى مِنْهُ وَلَمْ يُعْطِهِ اَجْرَهٗ"[2]

''(تیسرا) وہ شخص جس نے اپنے اَجیر سے کام تو پورا لے لیا مگر اس کی اُجرت نہ دی۔''

---

[1] تفسیر معارف القرآن ج:۸ ص:۶۹۳ تا ۶۹۴۔

[2] صحیح البخاری، کتاب البیوع، باب إثم من باع حُرًّا، رقم الحدیث: ۲۲۲۷، وکتاب الإجارۃ، باب إثم من منع أجر الأجیر، رقم الحدیث: ۲۲۷۰۔

(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مزدور کی اُجرت جلد از جلد ادا کرنے کی تاکید میں یہاں تک فرمایا ہے کہ:

"اَعۡطُوا الأجِیۡرَ اجۡرَہ قبلَ اَنۡ یجفَّ عَرقہ"

''مزدور کی اُجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو۔''[1]

(۸) بندوں کے حقوق (حقوق العباد) کی نزاکت واہمیت کا اندازہ اس حدیث سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ:

''ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرین سے پوچھا'' تم مفلس کسے کہتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا: ہم مفلس اسے کہتے ہیں جس کے پاس نہ درہم ہو، نہ سامان، آپ نے فرمایا:

"اِنَّ الۡمُفۡلِسَ مِنۡ اُمَّتِیۡ مَنۡ یَّاۡتِیۡ یَوۡمَ الۡقِیَامَۃِ بِصَلَاۃٍ وَصِیَامٍ وَزَکٰوۃٍ، وَیَاۡتِیۡ قَدۡ شَتَمَ ھٰذَا وَقَذَفَ ھٰذَا وَاَکَلَ مَالَ ھٰذَا وَسَفَكَ دَمَ ھٰذَا وَضَرَبَ ھٰذَا، فَیُعۡطٰی ھٰذَا مِنۡ حَسَنَاتِہٖ وَھٰذَا مِنۡ حَسَنَاتِہٖ، فَاِنۡ فَنِیَتۡ حَسَنَاتُہ قَبۡلَ اَنۡ یُّقۡضٰی مَا عَلَیۡہِ اُخِذَ مِنۡ خَطَایَاھُمۡ، فَطُرِحَتۡ عَلَیۡہِ، ثُمَّ طُرِحَ فِی النَّارِ"

''مفلس میری اُمت میں وہ شخص ہے جو قیامت کے دن (میدانِ حساب میں) نماز، روزے اور زکوٰۃ لے کر آئے گا، (لیکن) وہ اس حالت میں آئے گا کہ (دُنیا میں) اس نے کسی کو گالی دی ہوگی، کسی پر تہمت لگائی ہوگی، کسی کا مال (ناحق) کھایا ہوگا، کسی کا خون بہایا ہوگا، کسی کو مارا پیٹا ہوگا، لہٰذا اس کی کچھ نیکیاں ایک کو دے دی جائیں گی، کچھ دُوسرے (تیسرے، چوتھے، پانچویں) کو، پھر اگر اس کی نیکیاں حق داروں کے حقوق کی پوری ادائیگی سے پہلے ختم ہوگئیں تو

---

[1] سنن ابن ماجة، باب أجر الأجراء: ۱۷۸۔

حق داروں کے گناہ اس پر ڈال دیئے جائیں گے، اور اسے آگ میں پھینک دیا جائے گا۔''[1]

خلاصہ اس ساری بحث کا یہ ہے کہ آجر و اَجیر سمیت ہر شخص اپنے ذمہ کی ڈیوٹی اور فرائضِ منصبی دیانت داری کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر اور اپنی قبر اور میدانِ حساب کو سامنے رکھ کر انجام دینے لگے تو حقوق بھی سب کے مل جائیں گے، اور معاشرے سے کرپشن کا بھی خاتمہ ہو جائے گا، ورنہ لاکھ تدبیریں بھی مطلوبہ نتائج پیدا نہ کر سکیں گی، اور اس کا راستہ سوائے اس کے نہیں کہ معاشرے کے تمام چھوٹے بڑے اَفراد میں دِینی شعور، ایمان و یقین، فکرِ آخرت اور خوفِ خدا پیدا کرنے کے لئے ہر ممکن ذرائع اور وسائل استعمال میں لائے جائیں، اور مسلم حکومتیں اس کو اپنی اَوّلین ترجیح قرار دیں۔

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم الظلم، رقم الحدیث: ۴۵۳۷۔

(۶)

ایک دُوسرے کی خیرخواہی فریقین میں برادرانہ تعلق

صنعتی تعلقات کے سلسلے میں چھٹا اہم اُصول یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات نے اِن تعلقات کو برادرانہ رشتہ بنا کر عبادت کا تقدس عطا کر دیا ہے۔ سرمایہ داری نظامِ معیشت (Capitalism) کی بنیاد چونکہ خالص مادّی فلسفے اور خودغرض و بے لگام اِنفرادی ملکیت کے اُصول پر اُٹھی ہے، اس لئے اس نظام میں آجر اور اَجیر کے درمیان ''طلب ورسد'' (Demand and Supply) کا بالکل کُھر دُرا اور محض رسمی تعلق ہوتا ہے، ایک دُوسرے کی خیرخواہی یا بے غرض ہمدردی کا اس میں کوئی خانہ نہیں، آجر (Entreprencur) صرف اس حد تک اجیر (Labour) کی انسانیت کا اِحترام کرتا ہے جہاں تک وہ اپنے کاروبار کے لئے اس کے ہاتھوں مجبور ہے، جہاں یہ مجبوری ختم ہو جاتی ہے وہاں وہ اس پر بسا اوقات اپنے ظلم کا شکنجہ کسنے میں بھی دریغ نہیں کرتا۔ دُوسری طرف اجیر صرف اس وقت تک اپنی ڈیوٹی ادا کرتا ہے جب تک وہ اس پر مجبور ہے، جہاں یہ مجبوری نہیں رہتی وہاں بسا اوقات وہ کام چوری، وقت چوری، بدعہدی، سازشوں اور ہڑتال سے بھی نہیں چوکتا۔ لہٰذا مزدور اور سرمایہ دار میں ایک دائمی کشمکش جاری رہتی ہے، اور دونوں کے درمیان کوئی صحت مند رشتہ قائم نہیں ہو پاتا، جس کا اثر صنعتی پیداوار پر بھی لازماً پڑتا ہے، اور دونوں فریق اِطمینان وسکون اور باہمی اِعتماد سے محروم رہتے ہیں۔

اسلام نے اَجیر اور آجر کے درمیان ''طلب ورسد'' کے قدرتی نظام کا اگرچہ تحفظ

کیا ہے، جیسا کہ پیچھے بابِ اوّل میں تفصیل سے آچکا ہے، لیکن ساتھ ہی دونوں کو کچھ ایسی ہدایات بھی دی ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے تو ان کا باہمی رشتہ ایک خشک رسمی اور خودغرضانہ تعلق نہیں رہتا بلکہ برادرانہ رشتہ بن کر عبادت کا سا تقدس حاصل کر لیتا ہے۔

اَجیر (ملازم اور مزدور) کے حقوق مالک پر

آجر کا طرزِ عمل اَجیر کے ساتھ کیا ہونا چاہئے؟ اس کو قرآنِ حکیم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں ان کے آجر (حضرت شعیب علیہ السلام) کا یہ جملہ نقل کر کے واضح کر دیا ہے کہ:

وَمَآ اُرِیْدُ اَنْ اَشُقَّ عَلَیْكَ ۭ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ﴿۲۷﴾

''اور میں تم پر کوئی مشقت ڈالنا نہیں چاہتا، (کام لینے وغیرہ میں آسانی برتوں گا) تم مجھ کو ان شاء اللہ نیک لوگوں میں سے پاؤ گے۔''

(سورۂ قصص: ۲۷)

اس نے واضح کر دیا کہ ایک مسلمان آجر اس وقت تک ''نیک'' نہیں ہوسکتا جب تک وہ اپنے اَجیر کو بیجا مشقت اور تکلیف سے بچانے کی فکر نہ رکھتا ہو۔ نیز رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"اِنَّ اِخْوَانَكُمْ خَوَلُكُمْ جَعَلَهُمُ اللّٰهُ تَحْتَ اَيْدِيْكُمْ، فَمَنْ كَانَ اَخُوْهُ تَحْتَ يَدِهٖ فَلْيُطْعِمْهُ مِمَّا يَاْكُلُ وَلْيُلْبِسْهُ مِمَّا يَلْبَسُ، وَلَا تُكَلِّفُوْهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ، فَاِنْ كَلَّفْتُمُوْهُمْ مَا يَغْلِبُهُمْ، فَاَعِيْنُوْهُمْ"

تمہارے خادم تمہارے بھائی ہیں، انہیں اللہ نے تمہارے زیردست (ماتحت) کیا ہے، لہٰذا جس شخص کا کوئی بھائی (یعنی خادم) اس کے ماتحت ہو اسے چاہئے کہ وہ جس قسم کا کھانا خود کھاتا ہے اس میں سے

اس کو بھی کھلائے، اور جس قسم کا لباس خود پہنتا ہے اس میں سے اس کو بھی پہنائے، اور ان پر کسی ایسے کام کا بوجھ نہ ڈالو جو ان کی برداشت سے زیادہ ہو، اور اگر ایسے کام کا بوجھ ڈالو تو اس میں ان کی مدد کرو۔"[۱]

مزدور طبقہ عموماً غریب ہوتا ہے، ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور ہمدردی سے آجر کو آخرت کا عظیم الشان اَجر و ثواب تو ملتا ہی ہے دُنیا میں بھی مادّی فوائد حاصل ہوتے ہیں، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ:

"اِنَّمَا تُرْزَقُوْنَ وَتُنْصَرُوْنَ بِضُعَفَائِکُمْ"

"تم کو رزق اور مدد تمہارے کمزور اَفراد ہی کی وجہ (یا برکت) سے دی جاتی ہے۔"[۲]

یہ ہے وہ برادرانہ رشتہ جسے اسلام آجر اور اَجیر کے درمیان قائم کرنا چاہتا ہے۔

آج کل تو اَجیر ایک آزاد اِنسان ہوتا ہے اس کا حق و اِحترام تو اور بھی زیادہ ہے، جس زمانے میں اَجیر بیشتر غلام ہوتے تھے ان پر بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت کا یہ عالم تھا کہ حضرت اُمِّ سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ وفات سے قبل آپ کے آخری الفاظ یہ تھے، حتیٰ کہ یہی کلمات بار بار مسلسل فرماتے فرماتے آپ کی زبان مبارک خاموش ہوگئی کہ:

"اَلصَّلٰوۃَ وما ملکت اَیمانُکُمْ"

---

[۱] صحیح البخاری، کتاب العتق، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم العبید اخوانکم فاطعموھم الخ ج:۱ ص:۳۴۶۔

[۲] مسند احمد عن ابی الدرداء، ج:۵ ص:۱۹۸۔

''نماز کا خیال رکھو، اور ان لوگوں کا جو تمہارے مملوک (غلام وغیرہ) ہیں۔''[1]

آجر (مالک) کے حقوق اَجیر (ملازم و مزدور) پر

دُوسری طرف غلاموں کو یہ تلقین فرمائی گئی کہ انہیں اپنی ڈیوٹی صرف ضابطے کی خانہ پُری کے لئے نہیں بلکہ مالک کی خیر خواہی اور اسے فائدہ پہنچانے کی لگن کے ساتھ انجام دینی چاہئے، یعنی اس کام میں جسم کے ساتھ ان کا دِل بھی شامل ہونا چاہئے، اور انہیں اس خیر خواہی اور حسنِ عمل پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قابلِ رشک بشارت دی ہے کہ:

"اَلْعَبْدُ إِذَا نَصَحَ سَيِّدَهُ وَأَحْسَنَ عِبَادَةَ رَبِّهِ كَانَ لَهُ أَجْرُهُ مَرَّتَيْنِ"

''غلام جب اپنے مالک کی خیر خواہی کرے اور اپنے رَبّ کی عبادت بھی اچھی طرح کرے تو اس کو (ہر عمل) کا ثواب دُوسروں کے مقابلے میں دُہرا ملے گا۔''[2]

غرض! آجر ہو یا اَجیر، اور حاکم ہو یا محکوم، اسلامی تعلیمات کی رُو سے ان کے درمیان صرف ضابطے کا خشک اور خودغرضانہ تعلق کافی نہیں، بلکہ ان کے ایمان کا تقاضا ہے

---

[1] سنن ابن ماجة، كتاب ما جاء في الجنائز، باب ما جاء في ذكر مرض رسول الله صلى الله عليه وسلم، رقم الحديث:۱۶۲۵۔ مطبع دار إحياء التراث العربي۔ اور مسند احمد میں حضرت اُمّ سلمہ اور حضرت انس رضی اللہ عنہما دونوں کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ وصیت مسلسل فرماتے رہے، یہاں تک کہ یہ کیفیت ہوگئی کہ آپ یہ کلمات اپنے سینہ مبارک میں تو گردش دیتے رہے، مگر زبان انہیں ادا کرنے سے قاصر ہوتی چلی گئی۔ (دیکھئے مسند احمد ج:۶ ص:۲۹۰، وج:۶ ص:۳۱۱، ج:۶ ص:۳۲۱، ج:۳ ص:۳۱۷)۔

[2] صحيح البخاري، كتاب العتق، باب العبد إذا أحسن عبادة ربه ونصح سيده ج:۱ ص:۳۴۶۔

کہ ہر ایک سچے دِل سے دُوسرے کے ساتھ خیرخواہی اور ہمدردی کا سلوک کرے۔ اس کے کام کو اپنا کام سمجھے، اور جو فائدہ وہ دُوسرے فریق کو پہنچا سکتا ہے، اس میں دریغ نہ کرے۔ اسلام میں باہمی خیرخواہی و ہمدردی کی یہاں تک تاکید ہے کہ کسی شخص کا اِیمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک اس میں یہ صفت پیدا نہ ہوجائے کہ وہ جو بات اپنے لئے پسند کرتا ہے وہی دُوسرے کے لئے بھی پسند کرے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اِرشاد ہے کہ:

"لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْهِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِهٖ"[1]

"تم میں سے کسی کا اِیمان اس وقت تک (مکمل) نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے بھی اس (بھلائی) کو پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔"

بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو دِینِ اسلام کا خلاصہ اور لبِّ لباب ہی یہ بتایا ہے کہ:

"اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَةُ"

"دِینِ اسلام صرف خیرخواہی ہے"

صحابہ کرام نے پوچھا "کس کے ساتھ خیرخواہی؟" تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"لِلّٰهِ وَلِکِتَابِهٖ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِاَئِمَّةِ الْمُسْلِمِیْنَ وَعَامَّتِهِمْ"[2]

"اللہ کے ساتھ، اور اس کی کتاب (قرآن) کے ساتھ، اور اس کے رسول کے ساتھ اور مسلمانوں کے حکام اور عوام کے ساتھ۔"

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الإیمان، باب حُبّ الرسول صلی اللہ علیہ وسلم من الایمان، ج:۱ ص:۷۔

[2] صحیح مسلم، کتاب الإیمان، باب بیان أن الدین النصیحة، رقم الحدیث:۸۲۔

ایک شبہ اور اس کا اِزالہ

یہاں کسی کو یہ خیال ہوسکتا ہے کہ آجر اور اَجیر کو ایک دُوسرے کی خیرخواہی کی یہ اسلامی ہدایات زیادہ سے زیادہ ایک ضابطۂ اَخلاق کی حیثیت رکھتی ہیں جو خالص معاشی اور قانونی نقطۂ نظر سے اپنا کوئی اثر نہیں رکھتیں۔ اس کا جو جواب میرے والد ماجد مفتیٔ اَعظم پاکستان حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالے ''اسلام کا نظامِ تقسیمِ دولت'' میں[1] تحریر فرمایا ہے اسے یہاں بعینہٖ نقل کیا جاتا ہے:

''یہ اِعتراض اِسلام کے مزاج کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہوگا، یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اسلام محض ایک معاشی نظام ہی نہیں ہے، بلکہ وہ زندگی کا ایک مکمل دستورالعمل ہے، جس میں زندگی کے تمام شعبے باہم مربوط رہ کر ساتھ ساتھ چلتے ہیں، ان میں سے کسی ایک شعبے کو دُوسرے تمام شعبوں سے کاٹ کر سمجھنے کی کوشش لازماً غلط فہمیاں پیدا کرے گی، اس کے ہر شعبے کا صحیح رُوکار اسی وقت سامنے آسکتا ہے جب اسے اس کے مجموعی نظامِ زندگی میں فٹ کرکے دیکھا جائے، اس لئے اسلامی معاشیات کی بحث میں ان اَخلاقی ہدایات کو خارج از بحث قرار نہیں دیا جاسکتا۔

پھر اِسلام کا ایک اِمتیاز یہ ہے کہ اگر ذرا وسیع نظر سے دیکھا جائے تو اس کی اَخلاقی ہدایات بھی درحقیقت قانونی اَحکام ہیں، اس لئے کہ ان پر بالآخر آخرت کی جزا وسزا مرتب ہوتی ہے جس کو ایک مسلمان کی زندگی میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ یہ ''عقیدۂ آخرت'' ہی وہ چیز ہے جس نے نہ صرف یہ کہ اَخلاق کو قانون کا درجہ عطا کیا ہے بلکہ

---

[1] ص:۴۳ تا ۴۴۔

اِصطلاحی قوانین کی پشت پناہی بھی کی ہے۔قرآنِ کریم کے اُسلوب پر اگر آپ غور فرمائیں تو نظر آئے گا کہ اس کے ہر قانونی اور اَخلاقی حکم کے ساتھ ''خوفِ خدا'' اور ''فکرِ آخرت'' کے مضامین لگے ہوئے ہیں، اس میں اصل راز یہی ہے کہ درحقیقت قانون کی پابندی محض انسانی ڈنڈے کے زور سے کبھی نہیں کرائی جاسکتی، تاوقتیکہ انسان کی ہر نقل وحرکت اور ہر فکر وعمل پر پہرہ دینے کے لئے ''فکرِ آخرت'' موجود نہ ہو، یوں تو دُنیا کی ہزارہا سالہ طویل تاریخ جو پوری قانونی جکڑ بندیوں کے باوجود مظالم اور جرائم کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے، اس ناقابلِ اِنکار حقیقت کی تصدیق کرتی ہے، لیکن خاص طور سے آج کی مہذّب دُنیا نے تو اسے روزِ روشن کی طرح عیاں کردیا ہے کہ جس رفتار سے قانونی مشینریوں میں اضافہ ہو رہا ہے، اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے جرائم بڑھ رہے ہیں۔

اس لئے یہ سمجھنا کہ ''اَجیر'' اور ''آجر'' کے تعلقات محض قانونی جکڑ بندیوں سے دُرست ہوسکیں گے، انتہا درجے کی خودفریبی کے سوا کچھ نہیں، اس کا اصلی علاج صرف اور صرف ''فکرِ آخرت'' ہے اور اِسلام نے اس معاملے میں اسی پر زیادہ زور دیا ہے۔

آج کا ذہن جو محض دُنیوی زندگی کے اُلٹ پھیر میں اُلجھ کر ''مادّے'' کے اُس پار جھانکنے کی صلاحیت کھوچکا ہے، اس کے لئے شاید اس بات کو سمجھنا مشکل ہو، لیکن یقین ہے کہ اگر امن وسکون، انسانیت کے لئے مقدّر ہے تو وہ سینکڑوں ٹھوکریں کھا کر بالآخر اس حقیقت تک پہنچے گی جس کی طرف قرآنِ کریم نے بار بار توجہ دِلائی ہے، جس زمانے میں اسلام ایک عملی نظام کی حیثیت سے اس دُنیا میں کارفرما

تھا، اس وقت دُنیا اس قرآنی نظریے کی صداقت کو خوب اچھی طرح دیکھ چکی ہے، اس دور کی تاریخ میں ''آجر'' اور ''اَجیر'' کے جھگڑوں اور ہڑتالوں کی یہ کیفیت ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتی جس نے کچھ عرصے سے پوری دُنیا کو تہ وبالا کیا ہوا ہے، قرآن وسنت کی یہی وہ اخلاقی ہدایات تھیں جنہوں نے اس مسئلے کا اِطمینان بخش حل پیش کر کے دِکھایا اور جن کی وجہ سے اسلام کے قرونِ اُولیٰ کی تاریخ آجر کے جبر وتشدّد اور اَجیر کی ہڑتالوں سے تقریباً خالی نظر آتی ہے۔''

(۷)

قانونی مساوات، اور سستا آسان اِنصاف

پیچھے جو جواب نقل کیا گیا ہے، اس کا یہ مطلب بھی ہرگز نہیں کہ اسلام نے آجر واَجیر کے درمیان پیدا ہونے والے نزاعات کا تصفیہ اور مظلوم فریق کو اِنصاف دِلانے کا معاملہ صرف آخرت کی جزا وسزا پر چھوڑ کر اور دُنیا میں محض اخلاقی ہدایات دے کر مظلوم کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں عدالتی اور قانونی چارہ جوئی کی پشت پناہی کے لئے اسلام نے فکرِ آخرت اور خوفِ خدا کو اوّلین اور بنیادی اہمیت دی ہے، تاکہ قانون کی خلاف ورزی اور کمزوروں پر ظلم وزیادتی کی نوبت ہی شاذ ونادر پیش آئے، اور نزاعات کم سے کم پیدا ہوں، ہر شخص خدائی قانون کی پابندی نماز روزے کی طرح اپنا دِینی فرض سمجھ کر کرنے کا عادی بنے، اسے دُنیا کی سزا سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی ناراضی اور آخرت کی سزا کا خوف ہو، جس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ کسی ایسی جگہ بھی ظلم اور زیادتی کا مرتکب نہیں ہوگا جہاں پولیس اور عدالت کی رسائی نہیں، کیونکہ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ ہر جگہ حاضر وناظر ہے اور ذرّے ذرّے سے ہر وقت باخبر ہے۔ ورنہ جہاں تک دُنیا میں عدالتی اور قانونی چارہ جوئی کا معاملہ ہے، اس کا تو اِسلام نے ایسا فطری، مؤثر، آسان، سستا اور تیز رفتار نظامِ عدالت قائم کیا ہے کہ بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ دُنیا کے تمام موجودہ نظامہائے عدالت اس جیسا نظام پیش کرنے سے قاصر ہیں۔

آپ دیکھتے آرہے ہیں کہ نزاعات کے خاتمے اور مظالم کے اِنسداد کے لئے اِسلام نے ترتیب وار کتنے دُوررس اِنتظامات کئے ہیں۔

۱۔سب سے پہلا اِنتظام تو یہ کیا کہ صنعت وتجارت اور ملازمت ومزدوری کو دِین کا اہم حصہ بنا کر اسے صرف نجی یا خالص دُنیاوی کاروبار نہیں رہنے دیا، بلکہ حسنِ نیت اور حلال وحرام کا پابند کر کے اسے ایک عظیم عبادت بنا دیا ہے۔

۲۔ دُوسرا اِنتظام یہ کیا کہ ہر شخص کے ضمیر اور اس کے ہر کاروباری معاملے پر ''خوفِ خدا'' اور ''فکرِ آخرت'' کا پہرہ بٹھا دیا ہے، تاکہ کوئی کتنا بھی طاقتور کیوں نہ ہو، کمزور سے کمزور اِنسان کا حق دبالینا اس کے لئے آسان نہ رہے اور آخرت کی سزا کا خوف اسے دُوسرے کا حق ادا کرنے پر مجبور کردے۔

۳۔ تیسرا اِنتظام یہ کیا ہے کہ ہر ایسا لین دین، اور ملازمت ومزدوری کا معاملہ (معاہدہ) ناجائز اور ''فاسد'' قرار دے دیا ہے جس میں ابہام رہ جانے کے باعث فریقین کے درمیان نزاعات پیدا ہوتے ہوں، چنانچہ اسلامی حکومت کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ ایسے معاملات کو خلافِ قانون قرار دے کر ان کا سدِباب کرے۔

۴۔ چوتھا انتظام یہ کیا ہے کہ سود، سٹہ اور قمار (جوا) جیسے کاروبار کو قانوناً جرم قرار دے دیا ہے جو کسی نہ کسی طرح اَفراد یا معاشرے کے حقوق کو سلب کرنے یا جھگڑے فساد کو جنم دینے والے ہیں۔

ان اِقدامات کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک اسلامی معاشرے میں عدالتوں میں مقدمات کی آج کل کی طرح بھرمار نہیں ہوتی، کیونکہ ظلم وزیادتی اور نزاع وجدال کی نوبت ہی بہت کم پیش آتی ہے، تاہم جب یہ نوبت آہی جائے تو حکام اور عدالتوں کو قرآن وسنت کی ہدایات یہ ہیں کہ اوّلاً وہ باقاعدہ مقدمہ چلانے کے بجائے مدعی اور مدعا علیہ کے درمیان صلح کرانے کی مقدور بھر کوشش کریں، اگر یہ کوشش ناکام ہوجائے تو اس خدائی قانون کے تحت مقدمے کا فیصلہ کریں جس کے اُصول قرآن وسنت میں تفصیل

سے بیان کردیئے گئے ہیں۔ یہ اُصول کسی انسان کے بنائے ہوئے نہیں جس پر جانبداری، یا ذاتی مفاد یا کوتاہ نظری کی تہمت لگائی جاسکے، بلکہ اس بے نیاز ربِّ حکیم وقہار کے مقرّر کردہ ہیں جو اس پوری کائنات کا تنہا مالک اور حکومت واقتدار اور فیصلہ کرنے کا اصل حق دار ہے، اور جس کا ہر فیصلہ ہر سلیم الفطرت انسان کے نزدیک غیر جانبدارانہ اور مبنی بر انصاف ہے۔

آسان عدالتی طریقِ کار (پروسیجر)

پھر مقدمات کے تصفیے کا طریقۂ کار اسلام نے ایسا فطری، آسان اور سستا اختیار کیا ہے کہ ایک کمزور سے کمزور اور غریب سے غریب انسان بھی مذہب وملت کے امتیاز کے بغیر بہت مختصر وقت میں انصاف حاصل کرسکتا ہے۔ اسے انصاف کی کوئی فیس دینی نہیں پڑتی، وہ کسی وکیل کے واسطے کے بغیر ہی اپنا مقدمہ خود لڑسکتا ہے، موجودہ پیچ دار نظام کی طرح نہیں کہ اوّل تو ایک غریب مظلوم، عدالت کا رُخ کرنے ہی کی ہمت نہیں کرتا، ہمت کر بھی لے تو وکیلوں کی بھاری فیس اس کی ساری ہمت پر پانی پھیر دیتی ہے، ان فیسوں کو بھی کوئی برداشت کرلے تو مخالف وکیل کی ''قانونی مہارت'' پیشیوں پر پیشیوں کا جو لامتناہی سلسلہ شروع کرتی ہے، اور ہر پیشی پر اُٹھنے والے جو اخراجات اس مظلوم کو سہنے پڑتے ہیں، اس کے لئے قارون کا خزانہ اور عمرِ نوح بھی ناکافی دِکھائی دینے لگتی ہے۔ بیس بیس، تیس تیس سال سے بھی طویل زمانے تک مقدمہ چلتا رہتا ہے یہاں تک کہ فیصلہ ہونے سے پہلے ہی بسا اوقات مدعی اور مدعا علیہ دُنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں، مظلوم کو جتنا مالی نقصان ظالم نے پہنچایا تھا، اس سے زیادہ خرچ مقدمے پر ہوجاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج کا ایک غریب بلکہ متوسط آمدنی والا مظلوم بھی عدالت کا رُخ کرنے کے بجائے ظلم وستم کو برداشت کرنا ہی اپنے لئے آسان سمجھنے پر مجبور ہے۔

اسلام کا نظامِ عدالت؟

اسلام کا نظامِ عدالت کیا ہے؟ اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، اس پر مفصل اور ضخیم کتابیں موجود ہیں، افسوس ہے کہ آج دُنیا میں اسلامی نظامِ عدالت کا پورا عملی نمونہ شاید کہیں بھی باقی نہیں رہا، بہت سے مسلم ممالک پر جو حکمران مسلط کر دیئے گئے ہیں، وہ اس نظام کو اس لئے نافذ نہیں ہونے دیتے کہ وہ خود اس سے بے بہرہ ہیں، یا اسے ذاتی مفادات کے خلاف سمجھتے ہیں، تاہم جہاں کہیں یہ نظام کسی درجے میں باقی ہے، اس کی خوبیاں اور برکات آج بھی وہاں اسی حد تک دیکھی جاسکتی ہیں، سعودی عرب، آزاد کشمیر اور پاکستانی بلوچستان کے چند اَضلاع میں اسلامی عدالتوں کی کارکردگی کا جائزہ لیا جائے تو جس حد تک ان کا دائرۂ اِختیار ہے، اس حد تک ان خوبیوں کا مشاہدہ فی الجملہ کیا جاسکتا ہے جن کی طرف اُوپر اِشارہ کیا گیا۔

پاکستان تاریخ ساز قربانیاں دے کر اس لئے حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں مسلمانوں کو ہر شعبۂ زندگی میں اسلام کا عملی نمونہ قائم کرنے کا موقع ملے گا، لیکن جمہوریت کے نام پر یہاں جو کھیل کھیلا گیا، جن نااہلوں کے ہاتھوں میں زمامِ اِقتدار آئی جو مرعوب بلکہ دُشمنوں کی غلامی پر فخر کرنے والی ذہنیت یہاں بیوروکریسی کی صورت میں کارفرما رہی، اس نے قربانیاں دینے والوں کے سارے خواب چکنا چور کر ڈالے، اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۝

ٹریڈ یونین کی ضرورت کیوں؟

ٹریڈ یونین کی ضرورت سرمایہ داری نظام (Capitalism) میں پیش آتی ہے، کیونکہ اس نظام میں وسائلِ معاش سرمایہ داروں اور اَفسر شاہی کے قبضے میں ہوتے ہیں،

ملازم یا مزدور جب ملازمت کرنے آتا ہے تو اپنے بال بچوں کو فاقوں سے بچانے کے لئے کم اُجرت اور سخت شرائط کو بھی مجبوراً قبول کرلیتا ہے، لیکن سودی نظامِ تجارت ومعیشت کا لازمی خاصہ یہ ہے کہ مہنگائی بڑھتی جاتی، اور کرنسی کی قوتِ خرید کم ہوتی جاتی ہے، جس کا ایک سبب من جملہ دُوسرے اسباب کے یہ ہے کہ اس نظام میں بڑے سے بڑے سرمایہ دار (اِلّا ماشاء اللہ) اپنے کارخانوں اور تجارتی منصوبوں کے لئے بنک سے (جو سب سے بڑا سرمایہ دار ہے) سودی قرضے لیتے رہتے ہیں (چھوٹے تاجروں کو تو قرض ملتا ہی نہیں) اور جتنا سود وہ بنک کو اَدا کرتے ہیں اسے بھی اپنی مصنوعات اور مالِ تجارت کی لاگت پر ڈال کر ان کی قیمتیں اُسی تناسب سے بڑھاتے رہتے ہیں، اس طرح قرض لینے والے سرمایہ دار بھی منافع کماتے ہیں، اور بنک بھی، سود کا سارا بوجھ مہنگائی کی صورت میں عوام کی طرف منتقل ہوجاتا ہے، چنانچہ مہنگائی میں یہ اضافہ صرف غریب ملکوں ہی میں نہیں بلکہ اِنتہائی مال دار ممالک میں بھی تسلسل کے ساتھ کم وبیش جاری رہتا ہے، امریکا، جاپان اور یورپی ممالک کی مثالیں سامنے ہیں ان ملکوں میں دس سال پہلے کی اور آج کی قیمتوں کا موازنہ کرکے دیکھ لیا جائے، حقیقت واضح ہوجائے گی۔ چنانچہ مزدور یا ملازم نے جس تنخواہ پر کام شروع کیا تھا، کچھ ہی مدّت بعد وہ اس کی بنیادی ضروریات اور بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے ناکافی ہوجاتی ہے۔ اِدھر سرمایہ دار اگر سنگ دل اور خوفِ آخرت سے محروم ہو تو وہ نہ صرف تنخواہ میں مناسب اضافہ نہیں کرتا بلکہ مزدور کی کمزوری (متبادل ذریعۂ معاش کی عدم دستیابی) سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اس کے پہلے سے طے شدہ جائز حقوق میں بھی گھپلا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سرمایہ دارانہ ظلم وستم سے بچنے کے لئے مزدوروں کی ٹریڈ یونین وجود میں آتی ہے، تاکہ اِجتماعی قوّت کا دباؤ ان کے مطالبات منوا سکے۔

سرمایہ داروں کی انجمنیں کیوں؟

دُوسری طرف سرمایہ دار بھی اس دباؤ سے بچنے اور حکومت سے اپنے مطالبات منوانے کے لئے اپنی انجمنیں تشکیل دیتے ہیں، اس طرح نہ صرف ہر کارخانے کی اِنتظامیہ اور مزدور دو متحارب گروہوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں، بلکہ رفتہ رفتہ پورا معاشرہ دوطبقوں میں بٹ جاتا ہے، ایک طرف سرمایہ دار ہوتے ہیں، دُوسری طرف کچلے ہوئے عوام، دونوں کے درمیان اسلامی بھائی چارے اور اِعتماد وتعاون کے بجائے ختم نہ ہونے والی نفرتوں اور عداوتوں کا زہر گھل جاتا ہے۔ ہر فریق (اِلاّ ماشاء اللہ) حلال وحرام اور حق وانصاف کو بالائے طاق رکھ کر دُوسرے کے خلاف جو کچھ کرسکتا ہے اس میں کسر نہیں چھوڑتا، پھر یہی نہیں ہوتا کہ ظلم صرف کارخانے دار ہی کرے، بلکہ ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کے اُصول پر اگر مزدوروں کو بھی کارخانہ دار پر ظلم کرنے کا موقع مل جائے تو وہ بھی اگر خوفِ آخرت نہ رکھتے ہوں تو اس میں کمی نہیں کرتے، کام چوری اور کارخانے کی املاک کو ناجائز طور پر اِستعمال میں لانے اور نقصان پہنچانے کو بھی اپنا حق تصوّر کرنے لگتے ہیں۔ بالآخر وہ منظر سامنے آنے لگتا ہے جسے قرآنِ حکیم نے یوں بیان کیا ہے:

''وَكَذٰلِكَ نُوَلِّي بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿١٢٩﴾''[1]

''اور ہم اسی طرح بعضے ظالموں کو دُوسرے ظالموں پر ان کے اعمال کے سبب مسلط کردیتے ہیں۔''[2]

---

[1] سورۂ اَنعام:۱۲۹۔

[2] تفسیر معارف القرآن ج:۳ ص:۴۵۳۔

ہڑتال اور تالہ بندی

غرض! صنعتی تعلقات میں خوشگواری، باہمی تعاون، مطلوبہ نتائج اور ایک دُوسرے کے حقوق نہ ٹریڈ یونین سے حاصل ہوتے ہیں، نہ سرمایہ داروں کی انجمنوں سے، نت نئے مسائل جنم لیتے اور جھگڑے بڑھتے جاتے ہیں۔

کبھی ''تالہ بندی'' ہوتی ہے، کبھی ہڑتال، اور دونوں کے نتیجے میں صنعت کا پہیہ کبھی سست اور کبھی جام ہوتا رہتا ہے، معاشی ترقی اور قومی خوش حالی کو گھن لگ جاتا ہے، اور معاشرے کی فضا بھائی چارے کے بجائے خودغرضی اور بے اِعتمادی کی گھٹن سے بھر جاتی ہے۔

موجودہ نظام میں اُجرتوں کا اِضافہ بھی دھوکا ہے

مہنگائی جب ناقابلِ برداشت ہوجاتی ہے تو سرکاری ملازمین کی انجمنیں اور کارخانوں کی ٹریڈ یونینیں تنخواہوں اور اُجرتوں میں اِضافے کی تحریک چلاتی ہیں، اور بالآخر اِضافے کا فیصلہ منوا کر یونینوں کے عہدے دار اپنے ممبران اور ساتھیوں کے سامنے سرخرو ہوجاتے ہیں، حکومت بھی خراجِ تحسین وصول کرلیتی ہے، بھولا بھالا مزدور بھی اِطمینان کا سانس لیتا، اور اِضافہ شدہ تنخواہ ملنے کے شوق میں ایک ایک دن گن گن کر گزارتا ہے، لیکن مہینوں اور برسوں کی اس پوری کوشش کے بعد بھی محرومی جن لوگوں کے حصے میں آتی ہے وہ یہی بے چارے مزدور اور نچلے ومتوسط طبقے کے ملازمین ہیں۔ کیونکہ اِضافے کے فیصلے کی سیاہی خشک ہونے سے پہلے ہی، حکومت اس اِضافی خرچ کو برابر کرنے کے لئے اتنے ہی ٹیکس بڑھا چکی ہوتی ہے، اِدھر سرمایہ دار بھی اپنی مصنوعات اور مالِ تجارت کی قیمتیں کم ازکم اتنی بڑھا دیتے ہیں کہ اُجرتوں میں اِضافے سے ان کے مصارف میں جو اِضافہ ہوا وہ بھی

واپس مل جائے، اور حکومت نے جتنے طرح طرح کے ٹیکس بڑھائے ان کی تلافی بھی ہوجائے، اس طرح سب ٹیکسوں کی تان بھی بالآخر متوسط اور نچلے درجے کے ملازمین، مزدوروں اور غریب عوام ہی پر آ کر ٹوٹتی ہے۔

بھولا بھالا مزدور جو اپنی تنخواہ میں مثلاً ۵ فیصد اِضافے پر خوش ہو رہا تھا، بازار پہنچ کر اسے پتہ چلتا ہے کہ اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں ۵ فیصد سے بھی زیادہ اِضافہ ہو چکا ہے اور اس کے حصے میں محرومی کے سوا کچھ نہیں آیا۔ لہٰذا کچھ عرصے کے بعد پھر تنخواہوں میں اِضافوں کے لئے تحریک چلتی ہے، اور ''بعد از خرابی بسیار'' پھر اِضافے ہوتے ہیں، پھر نئے ٹیکس لگتے ہیں، اور نئی مہنگائی کا آسیب آ کر پھر غریب کا نفع ٹوٹا برابر کر دیتا ہے۔

غرض! مہنگائی، اُجرتوں میں اِضافے، نئے ٹیکس، اور پھر مزید مہنگائی کا یہ شیطانی چکر عوام کی زندگیوں سے کھیلتا اور ان کا مذاق اُڑاتا رہتا ہے، اور غریب و امیر کے درمیان زندگی کی سہولتوں میں جو شرمناک فرق نسل در نسل چلا آرہا ہے اس میں کمی کے بجائے اِضافہ ہوتا جارہا ہے۔

آج سے ۲۰ سال پہلے پاکستان میں ایک بے ہنر مزدور کو یومیہ تقریباً پانچ روپے ملتے تھے، اور آج ۱۹۹۲ء[۱] میں اسے کم از کم پچاس روپے یومیہ اُجرت مل رہی ہے، لیکن اُجرت میں کئی سو فیصد اِضافے کے باوجود کیا اس کی زندگی میں جو تلخیاں اور محرومیاں گھل کر رہ گئی ہیں ان میں یا اس کی غربت میں کوئی ہلکی سی بھی کمی واقع ہوئی؟ یہ صورتِ حال اس تلخ حقیقت کو سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام کے باقی رہتے ہوئے تنخواہوں اور اُجرتوں کا اِضافہ بھی دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔

---

[۱] یہ بات میں نے ۱۹۹۲ء میں لکھی تھی، اور اب اکتوبر ۲۰۰۹ء میں جبکہ یہ مقالہ طباعت کے لئے جارہا ہے، بے ہنر مزدور کی یومیہ اُجرت دو سو سے تین سو روپے تک ہے۔ رفیع

زرعی آمدنی پر ٹیکس کی تجویز

آج کل زرعی آمدنی پر ٹیکس لگائے جانے کا مطالبہ بھی ہو رہا ہے، اس لحاظ سے یہ معقول دِکھائی دیتا ہے کہ جب صنعتکاروں، تاجروں اور ملازمین پر ٹیکس ہے تو جاگیرداروں پر کیوں نہ ہو، لیکن کیا جاگیردار جو حکومت کے ایوانوں پر بھی قابض ہیں، اس ٹیکس کا سارا بوجھ بھی زرعی پیداوار کی قیمتوں میں من مانا اِضافہ کر کے غریب عوام کی طرف منتقل نہیں کردیں گے؟ اور غریب کے لئے آٹا دال بھی گوشت کی طرح عنقا نہیں ہو جائے گا؟

مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ موجودہ حالات کے رہتے ہوئے اس ٹیکس کا نتیجہ بھی وہی نکلے گا جو دُوسرے بہت سے ٹیکسوں کا سامنے آ رہا ہے کہ یہ بھی قوم کے تعلیمی، فلاحی اور ترقیاتی منصوبوں کو مدد پہنچانے کے بجائے حکومت کے لئے عالمی اِداروں کا سود اَدا کرنے کی صلاحیت بڑھانے ہی میں کام آئے گا، تاکہ حکومت عالمی مالیاتی اِداروں سے مزید سودی قرضے مانگنے کے قابل ہو سکے۔ جس سے سود وصول کرنے والے سرمایہ دار ملکوں کا اُلّو ضرور مزید سیدھا ہو جائے گا، لیکن ڈر ہے کہ غریب عوام کے ہاتھوں سے کہیں سوکھی روٹی بھی نہ چھن جائے۔

خلاصہ! یہ کہ جب تک موجودہ معاشی نظام تبدیل نہیں ہوتا، جس کی بنیاد ہی جبر و مکر پر، جاگیردارانہ بے حسی اور سنگدلی پر، سرمایہ دارانہ چال بازی پر، اللہ اور یومِ آخرت سے بے خوفی پر، اور سود و قمار اور سٹہ وغیرہ کے ذریعے چوسے ہوئے غریبوں کے خون پر قائم ہے، اس وقت تک اس نظام کی پیدا کردہ بیماریوں کا شافی علاج ڈھونڈنا سراب کے پیچھے بھاگنے کے سوا کچھ نہیں۔ ظلم و جبر اور معاشی مکر و فریب سے کچلی ہوئی انسانیت پر اگر پھر سے امن و خوش حالی کا دور آنا ہے تو وہ صرف اِیمان و یقین اور اللہ کے سامنے یکساں جواب دہی.

کے گہرے احساس سے، جاگیردارانہ سخت گیری اور سرمایہ دارانہ یہودی چال بازیوں کے خاتمے سے، اور اللہ کی بندگی، اسلام کے منصفانہ فطری نظامِ معیشت اور اسلامی معاشرے کے قیام ہی سے آئے گا، اس کے بغیر صنعتی تعلقات کا بگاڑ ختم ہوگا، نہ مزدوروں اور عوام کے مسائل حل ہوں گے، اور نہ دُنیا چین وسکون اور امن وامان سے آشنا ہو سکے گی، بقول اسد ملتانی مرحوم ؎

مُژدکی ہو کہ فرنگی ہَوَسِ خام میں ہے
امنِ عالم تو فقط دامنِ اسلام میں ہے

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ
وَالصَّلَاۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِنَا خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ
وَعَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْنَ وَمَنْ تَبِعَھُمْ بِاِحْسَانٍ اِلٰی یَوْمِ الدِّیْنِ

محمد رفیع عثمانی عفا اللہ عنہ
خادم جامعہ دارالعلوم کراچی

کتابیات

نمبر شمار	کتاب	مصنف	مطبوعہ
۱-	القرآن الکریم		
۲-	الاتحاف شرح الاحیاء	علامہ سیّد محمد بن محمد الحسینی الزبیدیؒ	دار الکتب العلمیہ بیروت
۳-	الاحادیث المختارۃ	ابو عبداللہ محمد المقدسی الحنبلیؒ	مکتبۃ النہضہ مکۃ المکرمۃ
۴-	اسلام کا نظامِ تقسیمِ دولت	مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ	مکتبہ دار العلوم کراچی
۵-	البدایۃ والنہایۃ	علامہ اسماعیل بن عمر بن کثیرؒ	مکتبۃ المعارف بیروت
۶-	بہشتی زیور	حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ	دار الاشاعت کراچی
۷-	تاریخ الامم والملوک	علامہ ابو جعفر محمد بن جریر الطبریؒ	مطبعۃ الاستقامۃ قاہرہ
۸-	الترغیب والترہیب	اِمام عبدالعظیم بن عبدالقوی المنذریؒ	دار الکتب العلمیہ بیروت/ مکتبہ روضۃ القرآن پشاور
۹-	تفسیر ابن کثیر	اِمام اسماعیل بن عمر بن کثیرؒ	دار الفکر بیروت
۱۰-	تفسیر بغوی (معالم التنزیل)	علامہ بغویؒ	دار المعرفۃ بیروت
۱۱-	تفسیر رُوح المعانی	علامہ آلوسیؒ	مکتبہ رشیدیہ لاہور
۱۲-	تفسیر معارف القرآن	مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ	ادارۃ المعارف کراچی
۱۳-	جامع الترمذی	اِمام ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ الترمذیؒ	دار احیاء التراث العربی بیروت
۱۴-	حیاۃ المسلمین	حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ	ادارۂ اسلامیات لاہور
۱۵-	الدر المنثور	علامہ عبدالرحمٰن السیوطیؒ	دار الفکر بیروت
۱۶-	ربیع الابرار	علامہ زمخشریؒ	مطبعۃ العانی بغداد
۱۷-	رسولِ اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی	ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ	دار الاشاعت کراچی
۱۸-	سنن ابن ماجہ	اِمام ابن ماجہؒ	دار الفکر بیروت

نمبر شمار	کتاب	مصنف	مطبوعہ
۱۹-	سنن ابی داؤد	امام ابوداؤد السجستانیؒ	دار الفکر بیروت
۲۰-	سنن الدار قطنی	امام علی بن عمر الدار قطنیؒ	دار المعرفۃ بیروت
۲۱-	سنن الدارمی	امام عبداللہ الدارمیؒ	دار الکتاب العربی بیروت
۲۲-	السنن الکبریٰ للبیہقی	امام ابوبکر احمد بن الحسین البیہقیؒ	مکتبہ دار الباز مکۃ المکرمۃ
۲۳-	سنن النسائی	امام ابوعبداللہ نسائیؒ	دار الکتب العلمیہ بیروت/ قدیمی کتب خانہ کراچی
۲۴-	سیرۃ المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم	مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ	مکتبہ عثمانیہ لاہور
۲۵-	شرح السنۃ	علامہ بغویؒ	مؤسسۃ الرسالۃ بیروت
۲۶-	شرح النووی علیٰ صحیح مسلم	شیخ محی الدین یحیٰی بن شرف النوویؒ	داراحیاء التراث العربی بیروت
۲۷-	شعب الایمان للبیہقیؒ	امام ابوبکر احمد بن الحسین البیہقیؒ	دار الکتب العلمیہ بیروت
۲۸-	شمائل للترمذی	امام الترمذیؒ	داراحیاء التراث العربی بیروت
۲۹-	صحیح ابن حبان	امام ابوحاتم محمد بن حبانؒ	مؤسسۃ الرسالۃ بیروت
۳۰-	صحیح البخاری	امام محمد بن اسماعیل بخاریؒ	دار ابن کثیر بیروت/ قدیمی کتب خانہ کراچی
۳۱-	صحیح مسلم	امام مسلم بن الحجاج القشیریؒ	داراحیاء التراث العربی بیروت /قدیمی کتب خانہ کراچی
۳۲-	عمدۃ القاری	علامہ بدر الدین العینیؒ	داراحیاء التراث العربی بیروت
۳۳-	فتح الباری	علامہ ابن حجر العسقلانیؒ	دار المعرفۃ بیروت
۳۴-	فتح القدیر	علامہ کمال الدین المعروف بابن ہمامؒ	مکتبہ رشیدیہ کوئٹہ/ دار الکتب العلمیہ بیروت
۳۵-	الفردوس بماثور الخطاب	علامہ الدیلمیؒ	دار الکتب العلمیہ بیروت
۳۶-	فضائل تجارت	شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ	محمد یوسف رنگ والا کراچی/ ملک سنز کارخانہ بازار فیصل آباد
۳۷-	قصص القرآن	مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ	دار الاشاعت کراچی
۳۸-	الکبائر	علامہ محمد بن عثمان الذہبیؒ	دار الندوۃ الجدیدۃ بیروت

نمبر شمار	کتاب	مصنف	مطبوعہ
۳۹-	کتابتِ حدیث عہدِ رسالت وعہدِ صحابہ میں	حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مد ظلہم	ادارۃ المعارف کراچی
۴۰-	کتاب الکسب	اِمام محمد بن حسن الشیبانیؒ	دار البشائر بیروت
۴۱-	کشف الاستار	علامہ نور الدین الہیثمیؒ	مؤسسۃ الرسالۃ بیروت
۴۲-	مبادیٔ فلسفہ	مولانا عبد الماجد دریابادیؒ	
۴۳-	مجمع الزوائد	علامہ نور الدین الہیثمیؒ	دار الکتاب العربی بیروت
۴۴-	مسئلہ سود	حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ	ادارۃ المعارف کراچی
۴۵-	المستدرک للحاکم	اِمام ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ الحاکمؒ	دار الکتب العلمیہ بیروت
۴۶-	مسند احمد	اِمام احمد بن حنبلؒ	مؤسسۃ قرطبہ قاہرہ
۴۷-	مسند عبد بن حمید	اِمام ابو محمد عبد بن حمیدؒ	مکتبۃ السنۃ القاہرہ
۴۸-	مصباح الزجاجۃ	علامہ بوصیریؒ	دار العربیہ بیروت
۴۹-	مصنف ابن ابی شیبہ	اِمام ابو بکر عبد اللہ بن محمد بن ابی شیبہؒ	مکتبۃ الرشد الریاض
۵۰-	معجم الاوسط للطبرانی	اِمام ابو القاسم سلیمان بن احمد الطبرانیؒ	دار الحرمین قاہرہ
۵۱-	معجم الکبیر للطبرانی	ایضاً	مکتبۃ الزہراء موصل
۵۲-	المنجد		
۵۳-	نیل الاوطار	اِمام محمد بن علی بن محمد الشوکانیؒ	دار الحدیث قاہرہ

اسلامی معیشت کی خصوصیات
اور
نظامِ سرمایہ داری
نظامِ سرمایہ داری اور سوشلزم کے مقابلے میں اسلامی معیشت کی راہِ اعتدال
اور کارخانوں و مزدوروں کے تعلّقات کے اسلامی اُصول
حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب مدظلہ
مفتی اعظم پاکستان
ادارۃ المعارف کراچی